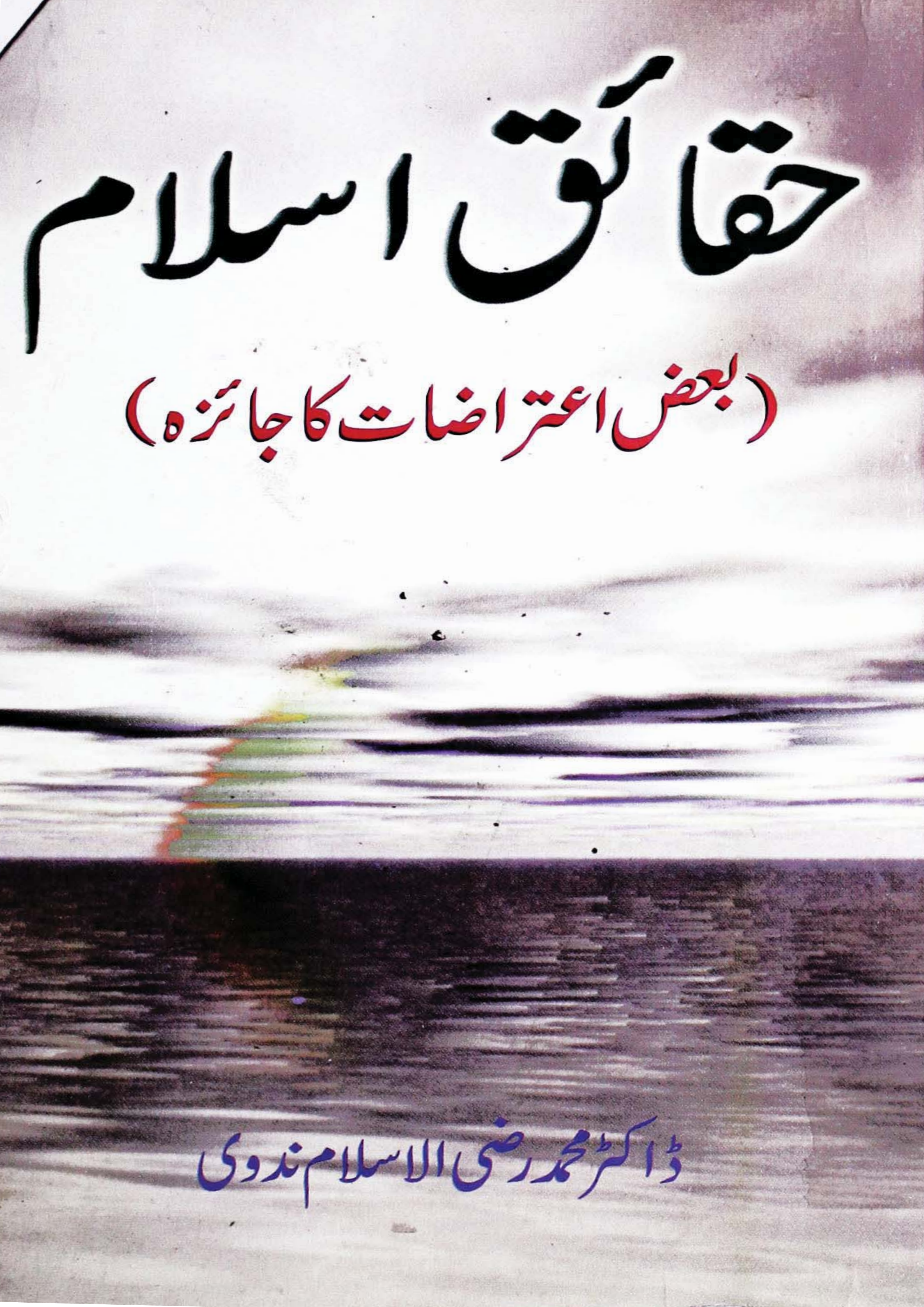

حقائق اسلام

(بعض اعتراضات کا جائزہ)

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

حقائقِ اسلام

(بعض اعتراضات کا جائزہ)

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ۲۵

111796

مطبوعات ہیومن ویلفیئر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) نمبر۸۴۲
©جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : حقائق اسلام (بعض اعتراضات کا جائزہ)
مصنف : ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
صفحات : ۲۱۶
اشاعت : اپریل ۲۰۰۸ء
تعداد : ۱۰۰۰
قیمت : -/۵۶ روپے
ناشر : مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز
ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵
فون: ۲۶۹۷۱۶۵۲، ۲۶۹۵۴۳۴۱ فیکس: ۲۶۹۴۷۸۵۸
E-mail: mmipub@nda.vsnl.net.in
Website: www. mmipublishers.net
مطبوعہ : نیو الائڈ پرنٹرز، دہلی-۶

HAQAEQ-E-ISLAM (Urdu)
By: Dr. Muhammad Raziul Islam Nadvi
Pages: 216
Price: Rs.56.00

فہرست

پیش لفظ ۱۱

اسلام پر اعتراضات ۔ اسباب اور تدارک ۱۵

ہندوستان میں اشاعتِ اسلام ۱۷

اسلام پر اعتراضات کے اسباب ۱۹

الف: اسلام سے ناواقفیت ۱۹

ب: مسلمانوں کی بے عملی اور غلط طرزِ عمل ۲۰

ج: اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا ۲۲

تدارک کی صورتیں ۲۳

الف: مسلمان اسلام کا سچا نمونہ بنیں ۲۴

ب: غیر مسلموں سے اختلاط اور ربط بڑھایا جائے ۲۵

ج: اعتراضات کا جواب دیا جائے ۲۵

مسلمانوں کا معاملہ ۲۶

قرآن

قرآن۔ اللہ کا کلام ۲۸
قرآن کا دعویٰ ۲۸
اہلِ مکہ کے بعض اعتراضات ۳۰
کیا قرآن کسی انسان کی تصنیف ہے؟ ۳۱
قرآن کا چیلنج ۳۳
چیلنج کا جواب نہ دیا جا سکا ۳۵
مشرکین کو قرآن کے غیر انسانی کلام ہونے کا یقین تھا ۳۵
یہ چیلنج رہتی دنیا تک کے لیے ہے ۳۷
قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کے دلائل ۳۸
۱۔ اسلوب، ادب اور نظمِ کلام ۳۸
۲۔ موضوعات کی وسعت ۳۹
۳۔ بیانات کی صداقت ۴۰
۴۔ یکسانی اور عدمِ اختلاف ۴۲
۵۔ احادیث سے مختلف اسلوب ۴۳
۶۔ ایک امی کی زبان سے ادائیگی ۴۴

عصرِ حاضر میں قرآنِ کریم کی معنویت ۴۶
ہر پرانی چیز فرسودہ اور بے کار نہیں ہوتی ۴۶
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم ۴۷
اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے ۴۸
قرآن کا موضوع انسان ہے ۴۹
قرآن کی تعلیمات ابدی ہیں ۵۰

قرآن کی کوئی بات غلط ثابت نہیں ہوئی ہے ۵۱
قرآن آج کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے ۵۲
کیا قرآن مخالفوں سے لڑنے اور انہیں قتل کرنے کا حکم دیتا ہے؟ ۵۳
اسلام جبر واکراہ کا مخالف ہے ۵۴
جنگ کی اجازت ظلم کے خاتمے کے لیے دی گئی ہے ۵۵
آیاتِ قتال کا تعلق حالتِ جنگ سے ہے ۵۹
اس طرح کے احکام دیگر مذاہب میں بھی ہیں ۶۱
ان احکام کی مخاطب اسلامی ریاست اور اس کی فوج ہے ۶۳
عام غیر مسلمین کے ساتھ اچھے سلوک کا حکم ۶۴
غیر مسلموں کی دوستی سے ممانعت کا مفہوم ۶۸

سیرتِ رسول

رسولِ کریم ﷺ کی کثرتِ ازواج کے مصالح ۷۴
ازواجِ مطہرات ۷۴
حضور ﷺ کی ازدواجی زندگی پر ایک نظر ۷۵
کثرتِ ازواج معیوب نہیں تھی ۷۷
قرآن نے چار کی حد مقرر کی ۷۸
نبی ﷺ کو اس حکم سے مستثنی رکھا گیا ۷۸
کثرتِ ازواج کے مصالح ۸۰
الف: اصحاب کی دل جوئی ۸۰
ب: دین کی توسیع اور استحکام ۸۱
ج: عداوتوں کا خاتمہ ۸۲
د: عورتوں کی تعلیم وتربیت ۸۳

ھ: حسنِ معاشرت کا اعلیٰ نمونہ ۸۴
حضور پر عائد بعض پابندیاں ۸۴
ازواجِ مطہرات کو دوسرے نکاح کا حق کیوں نہیں دیا گیا؟ ۸۷
رسول ﷺ اور آپؐ کے اہل بیت کی حیثیت ۸۷
ازواجِ نبی امت کی معلمات ہیں ۸۹
ایک وضاحت ۹۰
آں حضرتؐ نے آزاد بیویوں کی موجودگی میں باندیاں کیوں رکھیں؟ ۹۲
حضرت عائشہؓ کی کم سنی پر اعتراضات ۹۵
زوجین میں اصل باہمی موافقت ہے ۹۵
بلوغ کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی ۹۷
حضرت عائشہؓ کی ذات سے امت کو حاصل ہونے والے فائدے ۹۸
نکاحِ زینبؓ کا واقعہ ۱۰۰
حضرت زیدؓ کون تھے؟ ۱۰۰
حضرت زینبؓ کا حضرت زیدؓ سے نکاح ۱۰۱
حضور ﷺ کا حضرت زینبؓ سے نکاح ۱۰۲
مخالفین کا فتنہ ۱۰۳
رسول اللہ ﷺ نے جاہلیت کی غلط رسوم کو ختم کیا ۱۰۳
ایک اور اعتراض ۱۰۵
اس اعتراض کی غیر معقولیت ۱۰۵

عبادات

خانۂ کعبہ کی اہمیت و مرکزیت ۱۰۶
خانۂ کعبہ۔ اللہ کا گھر ۱۰۶
طواف کی حکمت ۱۰۸
قبلہ متعین کرنے کا مقصد ۱۱۰
خانۂ کعبہ کو قبلہ کیوں بنایا گیا؟ ۱۱۱
اللہ ہر جگہ موجود ہے ۱۱۲

حجرِ اسود کی حقیقت ۱۱۴
حجر اسود کیا ہے؟ ۱۱۴
تاریخ ۱۱۵
حضرت ابراہیمؑ کی زندگی پر ایک نظر ۱۱۶
حجرِ اسود حضرت ابراہیمؑ کی توحید پرستی کی یاد دلاتا ہے ۱۱۷
حجرِ اسود اللہ کے شعائر میں سے ہے ۱۱۸
رسول اللہ ﷺ کا عمل ۱۱۸
حضرت عمرؓ کا حکیمانہ قول ۱۱۹
تعظیم میں حد سے گزرنا جائز نہیں ۱۲۰
بوسہ دینا ضروری نہیں ۱۲۱

کیا حج دولت کا ضیاع ہے؟ ۱۲۳
حج کے فائدے ۱۲۴
الف : جذبۂ عبودیت کی آبیاری ۱۲۵
ب : تاریخی اور روحانی ماحول کا مشاہدہ ۱۲۷
ج : اتحاد اور مساوات کا بے مثال مظاہرہ ۱۲۷
د : عظیم الشان اجتماعیت ۱۲۸

گوشت خوری ۱۸۳
گوشت خوری پر اعتراض ۱۸۳
''اہنسا'' کا نظریہ ۱۸۴
نباتات میں بھی جان اور حس ہوتی ہے ۱۸۵
بلا ضرورت جانور کو ہلاک کرنا منع ہے ۱۸۶
ذبح کرنے میں رحم دلی کا مظاہرہ ۱۸۷
کیا گوشت خوری سے بے رحمی اور خوں خواری پیدا ہوتی ہے؟ ۱۸۹
ناکارہ مویشیوں کے اضافی بوجھ سے نجات ۱۹۰
گوشت خوری کی اجازت بیش تر مذاہب نے دی ہے ۱۹۲
قرآن میں مذکور بعض محرمات اور ان کی تحریم کی حکمتیں ۱۹۵
اسلام میں بعض جانوروں کا گوشت حرام کیوں ہے؟ ۱۹۶
اسلام کا فلسفۂ حلّت و حرمت ۱۹۶
بعض محرمات اور ان کی حکمتِ تحریم ۱۹۹
۱۔ مردار ۱۹۹
حادثاتی موت کی بعض صورتیں ۲۰۱
۲۔ خون ۲۰۳
۳۔ خنزیر کا گوشت ۲۰۵
۴۔ غیر اللہ کے نام پر ذبیحہ ۲۰۹
چند دیگر حرام جانور ۲۱۱
کتابیات ۲۱۳

پیش لفظ

ہندوستان میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ لیکن اس میں شدت اس زمانے میں آئی جب انگریزوں نے انیسویں صدی عیسوی میں اپنا اقتدار جمالیا اور ان کے زیرِ سایہ عیسائی مشنریوں نے تبلیغِ عیسائیت کی منصوبہ بند کوششیں شروع کیں۔ اسلام ان کے مقاصد کی تکمیل کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھا۔ چناں چہ انہوں نے اسلام پر عیسائیت کی بالاتری دکھانے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر جارحانہ حملے کیے اور اسلام کو ایک خوں آشام، غیر متمدن اور فرسودہ مذہب ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اس عہد میں مسلمان بڑے نازک دور سے گزر رہے تھے۔ اقتدار چھن جانے اور انگریزوں کے ہول ناک مظالم کی بنا پر وہ دوں ہمتی، احساسِ کم تری اور مرعوبیت کا شکار تھے۔ ان نازک حالات میں علمائے اسلام نے دفاعِ اسلام کی عظیم خدمت انجام دی اور حالات کی پروا کیے بغیر اسلام پر عیسائی مشنریوں کے اعتراضات کا منہ توڑ جواب دیا۔ انہوں نے ان سے زبانی بھی مناظرے کیے اور ان کی اشتعال انگیز تحریروں کا بھی زبردست رد کیا۔

ادھر کچھ عرصہ سے اسلام کے خلاف اعتراضات میں پھر شدت پیدا ہوئی ہے۔ اس مرتبہ اس محاذ پر ان قوتوں نے پیش قدمی کی ہے جو ہندوتو کی علم بردار ہیں اور ملک پر صرف ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کا غلبہ چاہتی ہیں۔ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود وہ نہ تو مسلمانوں کو اپنے اندر جذب کر سکی ہیں اور نہ اپنے مذہب اور اپنی تہذیب ہی کو اسلام اور اسلامی تہذیب کے مقابلے میں برتر ثابت کر سکی ہیں۔ اس لیے اب انہوں نے یہ منصوبہ

بنایا ہے کہ اسلام میں زبردستی خامیاں نکالی جائیں اور پروپیگنڈا کے زور پر عوام کے سامنے اسے بھیانک شکل میں پیش کیا جائے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ان اسلام مخالف منصوبوں کا مقابلہ کیا جائے، اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات اور شبہات کا جواب دیا جائے اور علمی بنیادوں پر اسلام کی حقانیت واضح کی جائے۔ اس کی ضرورت دو وجہوں سے ہے: ایک یہ کہ ذرائعِ ابلاغ کے ذریعہ اسلام کی تصویر مسخ کرنے کی جو پیہم کوشش ہو رہی ہیں، اندیشہ ہے کہ غیر مسلموں کی اکثریت ان سے متاثر ہو جائے اور اسلام کا سنجیدہ اور غیر جانب دارانہ مطالعہ کرنے کے بجائے اسی عینک سے اسلام کو دیکھنے لگے جو ذرائعِ ابلاغ کے ذریعہ اس کی نگاہوں پر چڑھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خود مسلمانوں کی بڑی تعداد کا اسلام سے محض روایتی تعلق ہے اور وہ اسلام کے عقائد، عبادات اور تعلیمات کے بارے میں صحیح علم وفہم سے محروم ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ غیر مسلموں کی جانب سے اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دینے کے موقف میں نہیں ہیں، بلکہ بسا اوقات کم علمی کی بنا پر خود بھی انہی شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور انہی کی جیسی زبان بولنے لگتے ہیں۔

الحمدللہ امت کے باشعور طبقہ کو اس ضرورت کا احساس ہے اور اس میدان میں خاطر خواہ کام ہو رہا ہے۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی ضرورت کی تکمیل کی ایک حقیر سی کوشش ہے۔ اس میں چند ایسے اعتراضات کا انتخاب کیا گیا ہے جو عام طور سے غیر مسلموں کی جانب سے اٹھائے جاتے ہیں اور اسلام کے بنیادی مصادر وماٰ خذ کی روشنی میں ان کا جائزہ لینے اور اسلام کا صحیح نقطۂ نظر واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میں شکر گزار ہوں صدرِ ادارۂ تحقیق مولانا سید جلال الدین عمری مدظلہ العالی کا کہ انہی کی زیرِ نگرانی یہ کام انجام پایا ہے۔ موصوف نے اس کے بعض حصوں کو بالاستیعاب ملاحظہ کر کے اور بعض پر ایک نظر ڈال کر مفید مشوروں سے نوازا ہے۔ ان مشوروں کی روشنی میں کتاب کو بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں کارکنانِ ادارہ محترم مولانا سلطان احمد اصلاحی اور مولانا محمد جرجیس کریمی کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس کی تالیف کے دوران وقتاً فوقتاً ان

سے استفادہ اور رائے مشورہ کرتا رہا ہوں۔

امید ہے کہ یہ کاوش ان حضرات کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگی جو دعوت کے میدان میں سرگرمِ عمل ہیں اور انہیں آئے دن غیر مسلموں کے مختلف سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اس سے وہ حضرات بھی فائدہ اٹھا سکیں گے جو ان موضوعات پر اسلام کا نقطۂ نظر سمجھنا چاہتے ہیں۔ اہلِ علم سے گزارش ہے کہ اس کی خامیوں، لغزشوں اور غلطیوں سے مصنف کو ضرور مطلع فرمائیں، تاکہ آئندہ ان کی اصلاح کی جا سکے۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اسے قبول کرے، اس کا فائدہ عام کرے اور اس کے اجر سے نوازے۔ انه نعم المولٰی و نعم المجیب

محمد رضی الاسلام

ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی علی گڑھ
۲/ اگست ۲۰۰۱ء

اسلام پر اعتراضات: اسباب اور تدارک

اللہ کے دین پر اعتراضات کرنے اور اس کے خلاف شکوک وشبہات پھیلانے کا سلسلہ زمانۂ قدیم سے جاری ہے۔ در اصل اسلام کی زد سماج کے جن افراد کی خواہشات، دنیوی اغراض اور مفادات پر پڑتی ہے اور اس کی وجہ سے انہیں اپنا اقتدار کھسکتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہ اس کے خلاف محاذ آرائی کرتے ہیں۔ اس کے ذریعہ وہ اپنی اصلاح کرنے کے بجائے خود اس میں خرابیاں ڈھونڈتے اور کیڑے نکالتے ہیں، اپنی خواہشات اور مفادات پر پردہ ڈالنے کے لیے خود اسلام کے علم برداروں پر مختلف الزامات عائد کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے مفادات قربان نہ ہوں اور ان کا اقتدار محفوظ رہے۔

انبیاء کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی قوموں نے ان کی دعوت کے جواب میں طرح طرح کی الزام تراشیاں کیں۔ انہوں نے اللہ کے پیغام کو سمجھنے، اس کی روشنی میں اپنی اصلاح کرنے اور انبیاء کی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنے کے بجائے مختلف طرح کے اعتراضات کیے۔ کبھی کہا کہ اگر اللہ کو کوئی پیغام بھیجنا ہی تھا تو وہ اس کام کے لیے کسی فرشتے کا انتخاب کرتا، اس نے ہم جیسے ایک انسان کو اس کے لیے کیوں منتخب کیا ہے؟ کبھی کہا کہ اگر یہ دعوت مبنی برحق ہوتی تو ہمارے آباء واجداد اسے ضرور قبول کرتے، مگر ہم نے تو ان سے اس طرح کی کوئی بات نہیں سنی۔ کبھی پیغمبر کے بارے میں کہا کہ اسے جنون یا آسیب ہو گیا ہے جس کی بنا پر اس کے منہ سے اس طرح کی باتیں نکل رہی ہیں۔ کبھی یہ الزام عائد کیا کہ اپنی دعوت کے پس پردہ اس کا مقصد اپنی برتری جتانا اور

اپنا اقتدار قائم رکھنا ہے۔ اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی تو اس نے ان کے بارے میں یہی سب باتیں کہیں:

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَو شَاءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي آبَائِنَا الْاَوَّلِيْنَ، اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌ بِهٖ جِنَّةٌ (المومنون: ۲۴۔۲۵)

اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا وہ کہنے لگے کہ "یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔ اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا۔ یہ بات تو ہم نے کبھی اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سنی ہی نہیں (کہ بشر رسول بن کر آئے) کچھ نہیں، بس اس آدمی کو ذرا جنون لاحق ہو گیا ہے۔

حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیبؑ اور دیگر پیغمبروں کی سرگزشت قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ ان کی قوم میں سے ایمان نہ قبول کرنے والوں نے ان کے خلاف اسی طرح کی باتیں کہیں (الاعراف۔ ۶۹، ہود۔ ۵۳، الشعراء: ۱۵۳۔۱۵۴، ۱۸۵۔۱۸۶، القمر۔ ۲۵ وغیرہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں پہنچ کر توحید کی دعوت پیش کی اور بنی اسرائیل پر ڈھائے جانے والے مظالم پر اس کی تنبیہ کی تو فرعون اور اس کے درباریوں نے ان پر اسی طرح کے الزامات عائد کیے۔ انہیں کبھی ساحر کہا تو کبھی سحر زدہ اور مجنون (الاعراف۔ ۱۱۰، ۱۳۲، بنی اسرائیل۔ ۱۰۱، طہ۔ ۵۷، ۶۳، الزخرف۔ ۴۹، الذاریات۔ ۳۹) کبھی ان کی دعوتِ حق اور ان کے ذریعے پیش کی گئی نشانیوں کو کھلا ہوا جادو قرار دیا (یونس۔ ۷۶، القصص۔ ۳۶) تو کبھی یہ الزام عائد کیا کہ وہ آباء واجداد کے مثالی طریقۂ زندگی سے ہٹا دینا چاہتے ہیں اور روئے زمین میں اپنے لیے عظمت و اقتدار کے خواہاں ہیں (یونس۔ ۷۸، طہ۔ ۶۳) کبھی کہا کہ ان کا مقصد اس علاقے کے باشندوں کو ان کی سرزمین سے بے دخل کر دینا ہے (الاعراف۔ ۱۱۰، طہ۔ ۶۳)

آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اعتراضات کیے گئے اور جو الزامات لگائے گئے وہ بھی دیگر انبیاء پر عائد کیے جانے والے الزامات و اعتراضات سے مختلف نہ تھے۔ آپؐ کے مخالفین یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ انہی جیسا ایک انسان اللہ کا فرستادہ

ہوسکتا ہے (الانبیاء۔۳، الفرقان۔۷، بنی اسرائیل۔۹۴) وہ آپ کو ساحر، کاہن، مجنون اور شاعر جیسے ''خطابات'' سے نوازتے (یونس۔۲، الطور:۲۹۔۳۰، الدخان۔۱۴، الصافات۔۳٦، الفرقان۔۸، المومنون۔۷۰، سبا۔٤٦، القلم۔۲، الاعراف۔۱۸۴) یہ الزام عائد کرتے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے، بلکہ اسے آپ خود گھڑ کر پیش کررہے ہیں اور کچھ دوسرے لوگ اس کام میں آپ کی مدد کرتے ہیں (الدخان۔۱۴، النحل۔۱۰۳) یہ شبہ پیدا کرتے کہ اس دعوت کا مقصد دراصل بڑائی حاصل کرنا اور اپنا حکم چلانا ہے (ص۔٦)

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جہاں بھی پہنچا وہاں کچھ لوگوں نے اسے اپنی فطرت کی آواز سمجھا اور اس پر لبیک کہا، تو کچھ لوگوں نے اسے قبول نہیں کیا، بلکہ اس کی مخالفت کی اور اس کے بارے میں طرح طرح کے اعتراضات اور شکوک و شبہات پھیلائے۔

ہندوستان میں اشاعتِ اسلام:

جنوبی ہند میں اسلام کی روشنی عرب مسلم تاجروں کے ذریعے صدرِ اول ہی میں پہنچ چکی تھی۔ یہ تاجر تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے جذبے سے سرشار تھے۔ انہوں نے اپنے اخلاق و کردار اور معاملات کی صفائی سے یہاں کی آبادی کے دلوں کو مسخّر کرلیا تھا اور ان کی بڑی تعداد دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئی تھی۔ اس طرح سراندیپ (لنکا) مالدیپ اور مالابار وغیرہ میں مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیاں قائم ہوگئی تھیں۔ شمالی ہند میں اسلام نسبتۀً بعد میں اور مسلم فاتحین کے ذریعے پہنچا۔ ان فاتحین کے ذریعے مختلف علاقوں کی تسخیر کے بعد وہاں مسلم علماء، دعاۃ، واعظین اور صوفیاء پہنچتے تھے اور تبلیغِ اسلام کی ان کی کوششوں سے اور ان کے کردار و عمل کو دیکھ کر مقامی آبادی مشرّف باسلام ہوجاتی تھی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد قبولِ اسلام کی یہ لہر کم زور پڑگئی اور اس میں وہ جوش اور سرگرمی باقی نہ رہی جو ابتدائی زمانے میں تھی۔ اس کے دو بنیادی اسباب تھے:

اول یہ کہ غیر عرب فاتحین، خواہ وہ ترک ہوں یا ایرانی، ان میں تبلیغِ دین کا وہ جذبہ مفقود تھا جو عرب فاتحین میں پایا جاتا تھا۔ ان حکمرانوں کی پوری توجہ صرف اپنی

حکومت کی توسیع اور استحکام پر رہتی تھی۔ انہوں نے ہندوؤں کو اپنی حکومت میں بڑے بڑے مناصب دیے، اسلام کی رُو سے ناجائز ہونے کے باوجود ان سے رشتہ داریاں قائم کیں اور ایسے احکام و فرامین نافذ کیے جن سے عوام میں ان کی حکومت کے خلاف بے چینی پیدا نہ ہونے پائے۔ ڈاکٹر محمد عمر نے ان حکم رانوں کے سلسلے میں لکھا ہے:

> ''وہ لوگ یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ بغیر رعایا کے تعاون کے حکومت نہیں کی جاسکتی، لہٰذا انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ نرمی اور مذہبی رواداری کا طرزِ عمل اختیار کیا، اور تبلیغِ اسلام کو اپنا لائحۂ عمل نہیں بنایا۔ ان لوگوں میں تبلیغ و اشاعت کا وہ جوش و خروش اور جذبہ بھی ٹھنڈا ہو چکا تھا جو خلفائے راشدین کے زمانے میں مسلمانوں میں پایا جاتا تھا''[۱]

دوم یہ کہ علماء اور صوفیاء کی کوششوں سے جو لوگ ہندو مذہب ترک کر کے مشرف باسلام ہوتے تھے، ان کی صحیح طریقے پر اسلامی تربیت نہ ہو پاتی تھی، چنانچہ وہ اپنے بہت سے قدیم موروثی عقائد، تصوّرات، اوہام اور رسوم و روایات سے اسی طرح چمٹے رہتے تھے جیسے اسلام قبول کرنے سے پہلے ان کا معاملہ تھا۔ اسی بنا پر ان کی ظاہری زندگی میں کوئی ایسا امتیاز نہ پیدا ہو پاتا تھا جو دوسروں کے لیے کشش کا باعث بنتا اور وہ اسلام کی جانب مائل ہوتے۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''عام مسلمانوں اور جاہل نو مسلموں اور ان کی اولاد میں، اور خاص طور پر ان میں جو مسلم تہذیب کے گہواروں اور مرکزوں سے بہت دور اندرونی علاقوں میں رہتے تھے، قدیم رسم و رواج اور عادات و اطوار کے اثرات باقی رہے اور ان علاقوں میں ایک مسلمان اور ہمسایہ ہندو میں صرف اتنا فرق پایا جاتا تھا کہ ایک کا نام ہندوانہ تھا اور دوسرے کا اسلامی'' [۲]

ان وجوہ سے ہندوستان میں مابعد صدیوں میں اسلام کا صحیح تعارف نہ ہو سکا۔ اس کے عقائد، عبادات، تہذیب اور معاشرت کے امتیازی پہلو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں ان کے دلوں میں غلط فہمیاں اور ذہنوں

---

[۱] ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر۔ ڈاکٹر محمد عمر، پبلی کیشنز ڈویژن نئی دہلی ۱۹۷۵ء، ص: ۱۵

[۲] ایضاً ص: ۵۹

میں شکوک وشبہات پیدا ہو گئے۔

اسلام پر اعتراضات کے اسباب:

غیر مسلموں کی جانب سے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ اس کے متعدد اسباب ہیں۔ اسلام کے صحیح تعارف اور اس کی دعوت وتبلیغ کے لیے ان کا تجزیہ اور تدارک ضروری ہے۔ چند اہم اسباب درج ذیل ہیں:

الف۔ اسلام سے ناواقفیت:

ہندوستان میں رہتے ہوئے مسلمانوں کو ایک ہزار سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ مخلوط ان کی آبادیاں ہیں۔ اس کے علاوہ تجارت، لین دین اور دیگر معاملات میں قدم قدم پر ان سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ دونوں کے درمیان اب بھی ایک آہنی دیوار حائل ہے۔ مسلمانوں کو اپنے برادرانِ وطن کے طور طریقوں، رسم ورواج، عقائد، تہواروں اور ان کی تاریخ اور دیگر مذہبی امور کا علم ہے نہ غیر مسلم مسلمانوں کے عقائد، عبادات، شعائر اور دین کی بنیادی تعلیمات کی صحیح واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ ناواقفیت انہیں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں طرح طرح کے شبہات میں مبتلا کرتی ہے اور وہ اپنے ذہنوں میں بڑا خلجان محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً مسلمان حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ایمان کلمۂ طیبہ کا جزء ہے جو صبح وشام ان کی زبانوں پر جاری رہتا ہے۔ اسی طرح وہ حج کے لیے مکہ مکرمہ جاتے ہیں۔ ایمان کی حقیقت اور حج کی تاریخ سے ناواقفیت کے نتیجے میں غیر مسلموں کے ذہنوں میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے دیش کے پوروجوں اور اپنی جنم بھومی سے عقیدت نہیں رکھتے، بلکہ ان کا تعلقِ خاطر دوسرے ملک کی دھرتی اور وہاں کے پورجوں سے ہے۔ مسلمان پنج وقتہ نمازوں کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن غیر مسلموں کو عموماً ان کے بارے میں بھی صحیح واقفیت نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں ایمرجنسی کے دور (۱۹۷۵۔۷۷ء) کا ایک واقعہ نقل کرنا دلچسپ ہوگا جسے مولانا سید جلال الدین عمری نے بیان کیا ہے:

''ہم کئی ایک اصحاب علی گڑھ جیل میں تھے۔ ہمارے ساتھ مختلف پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے غیر مسلم بھی تھے۔ ان میں ایک صاحب مقامی کالج کے تاریخ کے لکچرر تھے۔ اسلامی تاریخ کی بھی انہیں اچھی خاصی معلومات تھیں۔ وہ بڑی حیرت سے ہم لوگوں کو دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھتے دیکھتے تھے۔ ایک مرتبہ گفتگو کے دوران میں انہوں نے کہا کہ یہاں فرصت ہے، آپ ہر وقت نماز پڑھتے رہتے ہیں، کیا آپ لوگ اپنی عام زندگی میں بھی اسی طرح نماز پڑھتے ہیں؟ جب ہم لوگوں نے بتایا کہ ہم لوگ ہر روز ہر موسم میں ہر طرح کے حالات میں اسی طرح پابندی کرتے ہیں، اس میں دانستہ کوتاہی نہیں کرتے تو ان کی حیرت میں اور اضافہ ہوگیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں، کوئی یونیورسٹی سے متعلق ہے، کوئی لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہے، کوئی کاروباری ہے اور آپ کی گھریلو ذمہ داریاں بھی ہیں۔ اس سب کے ساتھ آپ پانچ وقت کی نماز کے لیے کیسے وقت نکال لیتے ہیں اور دن کا اتنا وقت نماز میں صرف کرنے کے بعد اور ذمہ داریاں کس طرح ادا کرتے ہیں؟ ان صاحب کے ذہن میں یہ بات تھی کہ جس طرح مندر یا گرجا میں عبادت کے لیے مخصوص پجاری ہوتے ہیں، اسی طرح مسجدوں میں موذّن ہوتا ہے، وہ وقت پر اذان دیتا ہے اور جسے کوئی کام نہیں ہوتا یا جسے فرصت مل جاتی ہے وہ مسجد چلا جاتا ہے۔ جس طرح اتوار کو چرچ میں بڑا مجمع ہوتا ہے اسی طرح جمعہ کو مسلمان بڑی تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں''[1]

اس طرح کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ برادرانِ وطن کو اسلام کی بنیادی باتوں کا بھی علم نہیں ہے۔

ب۔ مسلمانوں کی بے عملی اور غلط طرز عمل:

اسلام سے متعلق غلط فہمیوں کا ایک بڑا سبب مسلمانوں کی بے عملی اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ان کا طرز عمل ہے۔ وہ ایک امتِ دعوت اور ایک الٰہی اور آفاقی پیغام کے امین تھے، ان کا فریضۂ منصبی تھا کہ اللہ اور اس کے رسول کی برحق تعلیمات پر خود عمل

---

[1] ہندوستان میں اسلام کی دعوت، اہمیت اور تقاضے، مولانا سید جلال الدین عمری، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، ص: ۵۔۶

کرتے اور دوسروں کو بھی ان کی طرف دعوت دیتے۔ جب تک وہ یہ کام انجام دیتے رہے، اللہ کے بندے ان کی باتوں اور ان کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر بڑی تعداد میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کا یہ مشن کمزور پڑتا گیا۔ وہ دوسروں کو متاثر کرنے کے بجائے خود ان سے متاثر ہوتے گئے۔ انہوں نے غیر مسلموں کی نقالی میں ان کے تمام طور طریقے اپنا لیے۔ آج ہم عام مسلمانوں کے عقائد، تصوّرات اور رسوم کا ایک سرسری جائزہ لیں تو ان پر ہندوانہ اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں اور ان کے اور ہندوؤں کے اعمال میں بہت واضح مشابہت دکھائی دیتی ہے۔

اسلام توحید کا علم بردار ہے۔ اللہ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک کرنا اس کی نظر میں سب سے سنگین جرم ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں ہر گناہ اور خطا کی بخشش ممکن ہے، لیکن شرک ناقابلِ معافی ہے۔ توحید کے اتنے واضح تصور کے باوجود مسلم عوام بہت سے شرکیہ اعمال میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ جس طرح ہندو مندروں میں جا کر دیویوں اور دیوتاؤں کے سامنے اپنی جبینِ نیاز خم کرتے، ان کے سامنے نذریں چڑھاتے اور ان سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں، اسی طرح کا معاملہ مسلمانوں نے مزاروں کے ساتھ روا رکھا ہے۔ قریہ قریہ بزرگوں کے نام پر مزارات قائم ہو گئے ہیں جہاں عرس کے میلے لگتے ہیں، حاجت مندوں اور زائرین کا ایک جمِ غفیر جمع ہوتا ہے۔ پیشانیاں ٹیکی اور منّتیں مانی جاتی ہیں۔ درگاہوں اور مزاروں پر حاضری کو حج کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ مزاروں پر کھانے پینے کی اور دوسری چیزوں سے بڑھ کر اب جانوروں کی نذر چڑھائی جانے لگی ہے۔ ہندوؤں کی طرح مزاروں پر جھنڈے اور چھڑیاں لے جائی جاتی ہیں۔ الغرض مزاروں پر وہ تمام اعمال انجام دیے جاتے ہیں جو ہندو اپنے مندروں میں دیویوں اور دیوتاؤں کے سامنے کرتے ہیں۔

معاشرتی زندگی میں بھی مسلمان عوام بے شمار رسوم اور رواجوں کے اسیر ہیں۔ ان میں بچے کی پیدائش سے لے وفات تک بے شمار رسمیں مروّج ہیں۔ وہ سب کی سب ہندوانہ رسمیں ہیں۔ بہت سی رسموں کو جوں کا توں قبول کر لیا گیا ہے، بعض میں معمولی فرق کر دیا گیا ہے اور بعض کے نام وہی ہیں، مگر طریقے بدل دیے گئے ہیں۔ ان رسموں میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کا اسلامی طرزِ معاشرت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

ہندوؤں سے مشابہت کا بہت واضح مظاہرہ تہوار کے معاملے میں ہوتا ہے۔ ان کی نقالی میں مسلمانوں نے بہت سے تہوار ایجاد کر لیے جن میں وہ ٹھیک اسی طرح کے اعمال انجام دیتے ہیں جیسے ہندو اپنے تہواروں میں کرتے ہیں۔ ہندو دیوالی میں چراغاں کرتے ہیں تو مسلمان شب برأت اور ۱۲؍ ربیع الاول میں اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہندو ہولی، دیوالی اور دیگر مواقع پر پٹاخے چھوڑتے ہیں تو مسلمان شبِ برأت میں۔ ہندو جنم اشٹمی، بسنت پنچمی اور دسہرہ وغیرہ کے تہوار خوب دھوم دھام سے مناتے ہیں تو مسلمان محرم میں تعزیہ داری، رجب میں رجبی وغیرہ میں اسی طرح کی سرگرمی دکھاتے ہیں۔

اسلام سماجی مساوات کا قائل ہے۔ وہ نسل یا پیشہ کی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق یا امتیاز روا نہیں رکھتا، اس کی اسی تعلیم نے طبقوں اور فرقوں میں بٹی ہوئی انسانیت کو بہت متاثر کیا ہے۔ لیکن یہ صاف وشفاف تعلیم بھی ہندوستانی مسلمانوں کے رویہ سے گدلا گئی ہے۔ ہندوؤں کے ذات پات کے نظام سے متاثر ہوکر انہوں نے بھی مختلف برادریاں بنالی ہیں اور بعض کو ’’اشراف‘‘ اور بعض کو ’’اراذل‘‘ میں شمار کرتے ہیں۔

مسلمانوں کی بے عملی اور غلط طرزِ عمل کو اسلام کی سند حاصل نہیں ہے۔ اسلام کی تعلیمات اپنی جگہ برحق اور اٹل ہیں، خواہ مسلمان ان پر عمل کریں یا نہ کریں۔ لیکن عام لوگ یہ فرق ملحوظ نہیں رکھ پاتے۔ وہ مسلمانوں کے ہر عمل کو اسلام کی تعلیم کے عین مطابق سمجھنے لگتے ہیں۔ اس طرح اس کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

ج۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا

اسلام کے خلاف غلط فہمیاں پیدا ہونے کا تیسرا سبب وہ زبردست پروپیگنڈا ہے جو ذرائعِ ابلاغ کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برپا ہے اور جس میں گزشتہ کچھ عرصے سے مزید تیزی اور شدّت آگئی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب عیسائی مشنریوں نے یہ محاذ سنبھال رکھا تھا، لیکن ملک کی آزادی کے بعد اب ہندو فرقہ پرست طاقتوں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر بے بنیاد اعتراضات کرنا، اس میں نقائص نکالنا اور اسے فرسودہ اور زمانے کا ساتھ نہ دے سکنے والا مذہب ثابت کرنے کی کوشش کرنا

11296

ان کا مستقل مشن ہے۔ ان کا اصول یہ ہے کہ جھوٹ کو اتنی کثرت سے دہرایا جائے کہ لوگ اسے سچ سمجھنے لگیں۔ اس کی مثالیں آئے دن اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔

اسلام میں جہاد کے احکام مخصوص پس منظر رکھتے ہیں اور اس کی فرضیت بعض مخصوص شرائط کے ساتھ ہے۔ لیکن پروپیگنڈے کی طاقت سے اسے اتنا بھیانک کرکے پیش کیا جاتا ہے کہ ''جہاد'' کا لفظ سنتے ہی لوگوں پر دہشت طاری ہونے لگتی ہے۔

اسلام کو ایسا خون آشام مذہب بنا کر پیش کیا جاتا ہے جو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو جینے کے حق سے بھی محروم کر دیتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو ان سے جنگ کرنے اور انہیں قتل کرنے پر ابھارتا ہے۔ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں وہ مذاہب کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ مثلاً اس نے عورت کی کفالت کا بار مرد پر ڈال کر اور عورت کو معاشی جد وجہد سے آزاد رکھ کر اس پر احسان کیا ہے، لیکن اسے بھی حق تلفی شمار کیا جاتا ہے اور الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اسلام نے عورت کو گھر کی چہار دیواری میں قید کر دیا ہے۔ اسلام نے تعدّدِ ازدواج کی اجازت بعض مصالح کے پیش نظر مخصوص شرائط کے ساتھ دی ہے۔ لیکن اسے اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا اسلام نے ایسا کرنے کا تاکیدی حکم دیا ہے اور ہر مسلمان لازماً چار بیویاں رکھتا ہے۔ طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ متعدد سروے رپورٹوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ تعدّدِ ازدواج کے معاملے میں مسلمانوں کا تناسب ملک کے بہت سے فرقوں سے کم ہے۔

تدارک کی صورتیں:

برِ صغیر ہند میں اسلام پر اعتراضات کے یہ چند اہم اسباب ہیں۔ دعوتِ اسلامی کے علم برداروں کے لیے ان کے تدارک کی جد وجہد ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو شکوک وشبہات کے گہرے بادل چھائے رہیں گے اور وہ آفتابِ اسلام کی ضیا بار کرنوں کو سلیم الفطرت انسانوں تک نہ پہنچنے دیں گے۔ ان شبہات واعتراضات کے ازالے کے لیے درج ذیل تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں:

۱۔ مسلمان اسلام کا سچا نمونہ بنیں:

سب سے اہم اور اولین تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالیں۔ وہ اسلام کا چلتا پھرتا نمونہ بنیں۔ ان کی زندگیاں اسلام کی سچی ترجمانی کرتی ہوں۔ ان کے اعمال اور کردار کو دیکھ کر لوگ یقین کر سکیں کہ اسی چیز کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔ اخلاق و کردار کی طاقت ماضی میں بھی مسلّم رہی ہے اور اس کی تاثیر کا آج کل بھی مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے ابتدائی دور میں زندگی کی پاکیزگی اور کردار کی عظمت ہی وہ جوہر تھے جن سے متاثر ہو کر یہاں کے باشندوں کی خاصی تعداد حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئی تھی۔ آج اسلام اور مسلمانوں کی زندگیوں کا تضاد اسلام کو سمجھنے اور قبول کرنے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال اٹھتا ہے اور بجا طور پر اٹھتا ہے کہ اگر اسلام اتنا ہی اچھا مذہب ہے، اس کی تعلیمات اتنی اچھی ہیں اور اس میں اتنی خوبیاں پائی جاتی ہیں تو خود مسلمان اس پر عمل پیرا کیوں نہیں ہیں؟ خود ان کی زندگیاں ان سے کیوں عاری ہیں؟! واقعہ یہ ہے کہ اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں بن پڑتا۔ اپنی زندگیوں کی اصلاح، کتاب و سنت کی پیروی اور اسلام کے جملہ تقاضوں پر عمل کے ذریعے مسلمان ایک طرف بارگاہِ الٰہی میں سرخرو ہو سکیں گے۔ اور یہی اصل مقصود ہے۔ تو دوسری طرف دوسرے بندگانِ خدا کے اسلام کی طرف مائل ہونے کا ذریعہ بنیں گے۔ قرآن کریم میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے کہ مسلمان حقیقی مسلمان بنیں اور اسلام کے جملہ تقاضوں پر عمل کریں:

يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرۃ۔۲۰۸)

اے ایمان والو تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ

اس آیت میں اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ پوری شریعت پر عمل پیرا ہوں، اسلام کے جملہ احکام و قوانین اور حدود و فرائض پر کاربند ہوں، جن چیزوں کا حکم دیا گیا ہے ان سب پر عمل کریں اور جن کاموں سے روکا گیا ہے ان سب سے باز آجائیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ باتوں پر عمل کریں اور بقیہ کو چھوڑ دیں[1]

---

[1] تفسیر طبری، مطبعہ میمنیہ مصر ۱۳۲۹ھ، ۱۸۲/۲، تفسیر ابن کثیر، مکتبہ تجاریہ کبری مصر ۱۳۵۶ھ، ۲۴۷/۱

ب۔ غیر مسلموں سے اختلاط اور ربط بڑھایا جائے:

دوسری ضروری اور مطلوب چیز یہ ہے کہ غیر مسلموں سے اختلاط بڑھایا جائے اور ان سے روابط وسیع کیے جائیں۔ تعلقات میں کشیدگی اور روابط میں کمی سے غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں اور شکوک شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام انسان ایک کنبہ کے افراد ہیں، اس لیے ان کے درمیان برادرانہ تعلقات ہونے چاہییں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

أشهد أن العباد كلهم اخوة[1]

میں گواہی دیتا ہوں کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

غیر مسلموں سے روابط استوار کرنے سے ایک طرف اس خلیج کو پاٹنے میں مدد ملے گی جو بد قسمتی سے فرقہ پرستوں کی منصوبہ بند سازش سے دونوں فرقوں (مسلمانوں اور غیر مسلموں) کے درمیان حائل ہے تو دوسری طرف غیر مسلموں کو اسلامی تعلیمات سے واقفیت ہوگی اور انہیں کھلے دل سے ان پر غور کرنے اور ان کی معقولیت جاننے کا موقع ملے گا۔ یہ روابط انفرادی سطح پر بھی استوار کیے جائیں اور ان کے لیے دوسرے طریقے بھی اختیار کیے جائیں۔ انفرادی روابط میں شعوری کوشش ہونی چاہیے کہ ان کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش کی جائیں، انہیں بتایا جائے کہ زندگی کے مختلف معاملات میں اسلام کے کیا احکام ہیں اور ان کی کیا معقولیت ہے؟ نیز اس کام کے لیے عام اجتماعات، مجالسِ مذاکرہ اور سمیناروں کا انعقاد، اخبارات ورسائل، کتابچوں کی اشاعت، مراسلاتی پروگراموں کا اجراء اور دیگر تمام عصری ذرائع اختیار کیے جاسکتے ہیں۔

ج۔ اعتراضات کا جواب دیا جائے:

تیسرا کرنے کا کام یہ ہے کہ اسلام کے جن پہلوؤں پر اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کے جوابات دیے جائیں۔ کسی اعتراض پر مشتعل ہو جانا اور اعتراض کرنے والے

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الوتر، باب ۲۵

کو دشمنِ دین قرار دے کر اس کے خلاف احتجاج اور مظاہرہ پر اکتفا کرنا صحیح رویّہ نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ اعتراض کرنے والے نے محض اسلام سے ناواقفیت کی بنا پر وہ بات کہی ہو۔ چنانچہ اس کا سنجیدہ اور علمی و عقلی جواب اسے مطمئن کر دے اور اس کی غلط فہمی دور ہو جائے۔ اور اگر اعتراض کا محرک اس کی بد باطنی اور خباثتِ نفس ہے اور اس کا مقصد دوسروں کو اسلام کے بارے میں سوء ظن میں مبتلا کرنا اور اس سے دور کرنا ہے تو بھی اعتراض کا صحیح اور معقول جواب ان کی غلط فہمیاں دور کر دے گا اور حقیقت ان پر منکشف ہو جائے گی۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ سے ایک موقع پر بعض معترضین اور اسلام پر ان کے اعتراضات کا تذکرہ کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

”ان معترضین میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جن کا مقصد کسی نہ کسی طرح اسلام پر اعتراض جڑنا ہوتا ہے اور دنیا میں کوئی جواب بھی ان کے لیے تسلّی بخش نہیں ہو سکتا۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دلوں میں حقیقتِ حال سے ناواقفیت کی بنا پر نیک نیتی کے ساتھ شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ بات بالکل کافی ہے کہ آپ انہیں معقولیت کے ساتھ حقیقت سے آگاہ کر دیں“[1]

مسلمانوں کا معاملہ:

اسلام کے بارے میں اٹھائے جانے والے اعتراضات کا جواب دینا خود مسلمانوں کے تعلق سے فائدہ مند ہے۔ ان کی اکثریت روایتی مسلمان ہے۔ وہ اس لیے اسلام کا نام لیتے ہیں کیوں کہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے ہوئے پایا ہے۔ لیکن جہاں تک اسلام کے معتقدات، شعائر، عبادات، احکام و شرائع اور تعلیمات کا تعلق ہے تو وہ اس کے علم و فہم سے بے بہرہ ہیں۔ جو لوگ دین کی کچھ واقفیت رکھتے ہیں وہ دوسروں کے سامنے اس کی معقولیت واضح کرنے سے قاصر ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جنہوں نے عصری تعلیم حاصل کی ہے، لیکن وہ بھی دین سے یکسر نابلد ہیں۔ اس صورت حال میں غیر مسلموں کی جانب سے اسلام کے

---

[1] رسائل و مسائل، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۳ء، ۴/۱۲۹-۱۳۰

بارے میں جو شکوک شبہات ظاہر کیے جاتے ہیں، ان کا نہ صرف یہ عام مسلمان جواب دینے کی قدرت رکھتے، بلکہ ان میں سے بہت سے ناواقفیت کی بنا پر خود بھی انہی شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دینے سے جہاں ایک طرف غیر مسلموں کی غلط فہمیاں دور ہوں گی وہیں عام مسلمانوں کو بھی شرحِ صدر حاصل ہوگا۔

☆ ☆ ☆

قرآن۔ اللہ کا کلام

قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے جسے اس نے اپنے آخری رسول حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے جہاں ایک طرف قرآن کی شکل میں اپنے احکام وفرامین اور تعلیمات نازل کیں وہیں اپنے رسول کے ذریعے ان کا عملی نمونہ بھی پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چودہ سو سال سے زائد عرصہ گزر جانے مکے باوجود قرآن پوری طرح محفوظ ہے۔ اور اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف جوں کا توں باقی ہے۔ قرآن اسلام کا دستورِ اساسی ہے۔ اس کے تمام احکام اور تعلیمات واجب التعمیل ہیں۔ انہیں منسوخ کیا جاسکتا ہے نہ معطل اور موقوف۔

اسلام کے مخالفین قرآن پر مختلف طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ ان کا سلسلہ اس کے زمانۂ نزول ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ یہ اعتراضات اس کی حیثیت اور قدر و معنویت کے بارے میں بھی کیے جاتے ہیں اور اس کی تعلیمات پر بھی۔ اس سلسلے میں ایک عام بات یہ ہے کہ قرآن کو الہامی کتاب تسلیم نہیں کیا جاتا، بلکہ اسے دنیا کی دوسری کتابوں کے مثل ایک کتاب کی حیثیت دی جاتی ہے جسے محمد (ﷺ) نے پیش کیا تھا۔ غیر مسلم مصنفین اپنی تحریروں میں بلا تکلف اسے محمد صاحب کی کتاب لکھتے ہیں۔

قرآن کا دعویٰ:

قرآن نے اپنے بارے میں بہت زوردار انداز میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے جسے اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے پیغمبر کے ذریعے نازل کیا ہے۔

پیغمبر کا کام اسے صرف دوسرے انسانوں تک پہنچا دینا ہے۔ وہ اسے قبول کرتے ہیں یا رد کرتے ہیں اس کی کوئی ذمہ داری پیغمبر پر نہیں ہے:

اِنَّا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدٰی فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْھَا وَمَا اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ (الزمر۔۴۱)

اے نبی، ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کر دی ہے۔ اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا اپنے لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا اس کے بھٹکنے کا وبال اسی پر ہوگا، تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنَاہُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا مُبَشِّراً وَّنَذِیْراً (آیت:۱۰۵)

اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے۔ اور اے نبی، تمہیں ہم نے اس کے سوا اور کسی کام کے لیے نہیں بھیجا کہ (جو مان لے اسے) بشارت دے دو اور (جو نہ مانے اسے) متنبہ کرو

متعدد سورتوں کی ابتداء اس آیت سے ہوئی ہے:

تَنْزِیْلُ الْکِتَابِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ (الزمر۔۱، الجاثیۃ۔۲)[1]

اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت جو لوگ قرآن اور اللہ کے رسول پر ایمان نہیں لائے تھے وہ قرآن کی بعض ان آیات پر جو ان کی مرضی کے خلاف ہوتی تھیں اور ان کی زد ان کے موروثی عقائد پر پڑتی تھی، اللہ کے رسول سے کہتے تھے کہ کوئی دوسرا قرآن لے کر آیئے یا اس کی فلاں فلاں باتیں بدل دیجیے۔ رسول کو اس کا یہ جواب دینے کی ہدایت کی گئی کہ یہ تو اس وقت ہو سکتا تھا جب قرآن میں نے خود اپنی طرف سے پیش کیا ہوتا، لیکن میں تو وہی چیز پیش کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ پھر میں کوئی دوسرا قرآن کیوں کر لا سکتا

---

[1] اس مضمون کی قرآن میں بکثرت آیات ہیں۔ ملاحظہ کریں السجدہ۔۲، الاحقاف۔۱۰، الدھر۔۲۳، مومن۔۲، حٰم السجدہ۔۲، ۴۲، الواقعہ۔۸۰، الحاقۃ۔۴۳ وغیرہ

ہوں یا اس میں کوئی ترمیم کیسے کر سکتا ہوں؟!

وَاِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَائَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ،قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيَ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحَى اِلَيَّ اِنِّي اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (یونس۔۱۵)

جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ، جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ، یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ اے نبی ان سے کہو میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کچھ تغیر وتبدل کرلوں۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہول ناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

اہلِ مکہ کے بعض اعتراضات:

قرآن جس زمانے میں نازل ہورہا تھا، اس وقت اس کے بارے میں مکہ میں اسلام کے مخالفین حیران وششدر تھے۔ اس میں غیر معمولی تاثیر پائی جاتی تھی۔ سننے والوں کے دل اس طرف بے اختیار کھنچتے تھے۔ وہ ہمہ تن گوش ہوجاتے تھے۔ اس کی تاثیر کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کبھی اسے شاعری کے قبیل کی کوئی چیز قرار دیا، کبھی سحر کیا اور کبھی اس میں اور کاہنوں کے کلام میں مماثلت تلاش کی۔ قرآن نے ان تمام مزعوماتِ باطل کی تردید کی اور زور دے کر کہا کہ یہ ان میں سے کوئی چیز نہیں ہے، یہ تو اللہ کا کلام ہے:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ آيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (الأحقاف۔۷)

ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں اور حق ان کے سامنے آجاتا ہے تو یہ کافر لوگ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔

سورۂ یونس میں ہے:

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهٗ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْآنٌ مُّبِيْنٌ (آیت:۶۹)

ہم نے اس (نبیؐ) کو شعر نہیں سکھایا ہے اور نہ شاعری اس کو زیب ہی دیتی ہے۔ یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف پڑھی جانے والی کتاب

سورۂ الحاقہ میں اس سلسلے میں ان کے اعتراضات نقل کیے گئے اور ان کا جواب بھی دیا گیا:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلاً مَّا تُؤْمِنُوْنَ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلاً مَّا تَذَكَّرُوْنَ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ (الحاقة: ۴۰-۴۳)

یہ ایک رسولِ کریم کا قول ہے، کسی شاعر کا قول نہیں ہے، تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو، اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو، یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے ۔

کیا قرآن کسی انسان کی تصنیف ہے؟

مشرکینِ مکہ کہتے تھے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے، بلکہ اسے محمد (ﷺ) نے گھڑ کر پیش کیا ہے۔ آں حضرت ﷺ کو اس کا یہ جواب دینے کی ہدایت کی گئی کہ کوئی چیز خود گھڑ کر اسے اللہ کی طرف منسوب کرنا اور اپنی بات کو اللہ کی بات کہنا تو بہت بڑا جرم اور بہتان ہے۔ اگر کوئی شخص اس کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ اللہ کی بارگاہ میں ضرور اس کی سزا بھگت کر رہے گا:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئاً (الأحقاف-۸)

کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسول نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ ان سے کہو کہ اگر میں نے خود گھڑ لیا ہے تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے۔

سورۂ انعام میں ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِباً اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ (آیت: ۹۳)

اور اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑے، یا کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے، درآں حالے کہ اس پر کوئی وحی نازل نہ کی گئی ہو۔

یہ ایک ایسا الزام تھا جس میں کوئی جان نہیں تھی۔ آں حضرت ﷺ کا امّی ہونا معروف تھا۔ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اعلانِ نبوت سے قبل آپ کا ان لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں تھا جو پچھلے عہد کے واقعات کا علم رکھتے تھے اور حکمت ودانائی کی باتوں میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ مشرکینِ مکہ کو بھی احساس تھا کہ یہ بات چلنے والی نہیں ہے۔ اسی لیے انہوں نے ایک دوسری بات یہ کہی کہ قرآن کی تصنیف میں محمد (ﷺ) دوسروں کی مدد لیتے ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو انہیں خفیہ طور پر لکھ لکھ کر دیتے ہیں اور وہ انہیں دوسرے لوگوں کے سامنے اللہ کے کلام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ قرآن نے ان کے اس الزام کو بھی رد کیا اور اسے سراسر بہتان قرار دیا:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اِنْ هٰذَا اِلَّا اِفْكُ افْتَرَاهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ
آخَرُوْنَ فَقَدْ جَآءُوا ظُلْماً وَّزُوْراً وَقَالُوآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا
فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلاً. قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِىْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْماً (الفرقان:۴۔٦)

جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کردیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح وشام سنائی جاتی ہیں۔ اے نبی ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے اس نے جو زمین وآسمانوں کا بھید جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفور ورحیم ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ مکہ میں چند آزاد کردہ غلام تھے جو اہلِ کتاب میں سے تھے، وہ تورات کا علم رکھتے تھے اور اس کے مضامین بیان کرتے تھے۔ ان کے نام بھی مذکور ہیں: ایک عداس، حویطب بن عبدالعزیز کا آزاد کردہ غلام، دوسرا یسار، علاء بن الحضرمی کا آزاد کردہ غلام، تیسرا جبر، عامر بن الحضرمی کا آزاد کردہ غلام۔ نبی کریم ﷺ کی دعوت

سن کران لوگوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ آپؐ ان لوگوں کا خیال رکھتے تھے [1] مشرکین نے کہنا شروع کردیا کہ محمد جو قرآن تصنیف کر کے پیش کر رہے ہیں اس میں دراصل ان لوگوں کا تعاون شامل ہے۔ یہ لوگ تورات کے مضامین پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور انہیں آپ ﷺ اپنی زبان میں دوسروں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

قرآن کا چیلنج:

ان الزامات کے جواب میں قرآن نے چیلنج کیا کہ اگر تم کہتے ہو کہ محمد (ﷺ) نے قرآن خود گھڑ کر پیش کیا ہے، یا اس کی تصنیف میں کچھ دوسرے لوگوں سے تعاون لیا ہے اور یہ کہ وہ اللہ کا کلام نہیں ہے، بلکہ انسانی کاوشوں کا ثمرہ ہے تو تم بھی ویسا ہی کلام پیش کر کے دکھاؤ اور اس کام میں جن سے بھی چاہو تعاون حاصل کرلو۔ مکی دور کے مختلف اوقات میں، مختلف انداز سے یہ چیلنج کیا جاتا رہا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ يَّاْتُوا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ
لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (آیت:۸۸)

کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لاسکیں گے۔ چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔

پھر سورۂ یونس میں اس الزام کی پرزور تردید کی گئی اور کہا گیا کہ اگر معترضین اپنے دعویٰ میں سچے ہیں تو قرآن جیسی ایک سورت بنا کر دکھائیں:

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰی مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِیْ
بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ
اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (آیات:۳۷_۳۸)

اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی و تعلیم کے بغیر تصنیف کرلیا جائے، بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آچکا تھا، اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

---

[1] تفسیر کبیر، رازی ۳۵۳/۶، روح المعانی، آلوسی، جزء ۲۳۴/۱۸، سیرت ابن ہشام ۴۲۰/۱

یہ فرماں روائے کائنات کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کرلیا ہے؟ کہو اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورہ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو مدد کے لیے بلالو۔

سورۂ ہود میں دس سورتیں بنا کر لانے کا چیلنج دیا گیا:

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيَاتٍ .وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ .فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ (آیات: ۱۳-۱۴)

کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو ''اچھا یہ بات ہے تو اسی جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمہارے معبود) ہیں. ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلالو، اگر تم (انھیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو۔ اب اگر وہ (تمھارے معبود) تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے

سورۂ طور میں ان کے اس الزام کو نقل کرتے ہوئے ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس کے مثل کلام پیش کر کے دکھائیں:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ، فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صَادِقِيْنَ (آیات: ۳۳-۳۴)

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اسی شان کا ایک کلام بنا لائیں۔

یہ سورتیں مکّی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ مدنی دور کے آغاز میں سورۂ بقرہ نازل ہوئی جس میں آخری مرتبہ یہ چیلنج کیا گیا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ، وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ (آیت: ۲۳)

اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے یہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو بلالو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو، مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔

چیلنج کا جواب نہ دیا جاسکا:

مشرکین کو کئی سال تک وقفہ وقفہ سے یہ چیلنج کیا جاتا رہا، مگر وہ اس کا جواب دینے سے قاصر رہے۔ وہ زبانی دعوے کرتے رہے کہ قرآن کے مثل کلام ہم بھی پیش کرسکتے ہیں۔ لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا الانفال۔۳۱ (ہم چاہیں تو ایسی ہی باتیں ہم بھی بنا سکتے ہیں) وہ اللہ کے رسول اور قرآن کے بارے میں طرح طرح کی الزام تراشیاں کرتے رہے۔ قسم قسم کے مطالبے کرتے رہے۔ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں انہوں نے کیا کیا نہ کیا۔ بہت سی جنگیں لڑیں جن میں ان کے بہت سے سردار مارے گئے۔ ان سب کے مقابلے میں ان کے لیے کہیں زیادہ آسان تھا کہ وہ قرآن کے مثل ایک سورت پیش کرکے ثابت کردیتے کہ قرآن انسانی کلام ہے۔ اس طرح قرآن اور اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف ان کا الزام بھی ثابت ہوجاتا اور وہ ان زحمتوں سے بھی بچ جاتے جن کا وہ بعد میں شکار ہوئے۔ ان کے درمیان بڑے بڑے خطباء اور شعراء موجود تھے۔ مگر تمام تر دواعی و محرکات کے باوجود وہ اس کا معارضہ کرنے اور اس کے مثل لانے کی ہمت نہ کرسکے اور انہوں نے اس کے بارے میں مختلف الزامات اور بے بنیاد باتوں کو بار بار دہرانے پر اکتفا کیا۔[۱]

مشرکین کو قرآن کے غیر انسانی کلام ہونے کا یقین تھا:

کتبِ سیرت میں مذکور بعض واقعات سے پتا چلتا ہے کہ اہل مکہ اور خاص طور پر ان کے سرداروں کو اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ آں حضرت ﷺ جو کلام پیش کرتے ہیں اس کا سحر، شاعری اور کہانت وغیرہ سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور اس کا انداز ہی نرالا ہے۔ یہاں ایسے دو واقعات کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے:

ایک موقع پر قریش کے کچھ لوگ اپنے ایک سردار ولید بن مغیرہ کے پاس اکٹھا ہوئے۔ اس نے حاضرین سے کہا: ”لوگو، حج کا زمانہ آگیا ہے۔ اس موقع پر تمام عرب سے لوگ آئیں گے۔ انہوں نے تمہارے ان صاحب (حضرت محمد ﷺ) کا حال سن لیا

---

[۱] تفسیر قرطبی ۱؍۷۷

ہے۔ اس لیے ان سے متعلق کوئی ایک بات طے کرلی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ تم ان کے بارے میں مختلف طرح کی باتیں کرو اور اس طرح خود ہی ایک دوسرے کو جھٹلا دو اور ایک دوسرے کی تردید کردو‘‘ انھوں نے کہا ’’اے ابوعبد شمس، آپ ہی کوئی رائے تجویز کریں۔ ہم سب بھی وہی کہیں گے‘‘۔ ولید نے کہا: ’’آپ لوگ اپنی تجاویز پیش کریں، میں سنتا ہوں‘‘۔ کچھ لوگوں نے کہا: ’’ہم انہیں کاہن کہیں گے۔‘‘ ولید نے فوراً کہا: ’’اللہ کی قسم، وہ کاہن نہیں ہے۔ میں نے کاہنوں کو دیکھا ہے۔ جو کلام وہ پیش کرتا ہے وہ کاہنوں کی گنگناہٹ اور ان کے مسجّع فقرات سے مختلف ہے‘‘۔ انہوں نے کہا: ’’پھر ہم اسے مجنون کہیں گے‘‘۔ ولید نے کہا: ’’وہ مجنون بھی نہیں ہے۔ ہم جنون کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ نہ بہکی بہکی باتیں کرتا ہے، نہ الٹی سیدھی حرکات کرتا ہے اور نہ وسوسوں کا شکار ہے‘‘۔ ان لوگوں نے کہا: ’’پھر ہم اسے شاعر کہیں گے‘‘۔ ولید نے کہا: ’’وہ شاعر بھی نہیں ہے۔ ہم جملہ اصنافِ سخن — رجز، ہزج، قریض، مقبوض اور مبسوط — سے واقف ہیں۔ ان کے کلام پر شاعری کا اطلاق نہیں ہوسکتا‘‘۔ انہوں نے کہا: ’’ہم انہیں ساحر کہیں گے‘‘۔ ولید نے کہا: ’’وہ ساحر بھی نہیں ہیں۔ ہم جادوگروں اور ان کے طور طریقوں سے واقف ہیں۔ وہ تو ان لوگوں کی طرح گرہوں میں پھونکنے کا عمل نہیں کرتے۔‘‘ ان لوگوں نے کہا: ’’اے ابوعبد شمس، پھر ہم لوگ کیا کہیں؟‘‘ اس نے جواب دیا: ’’اللہ کی قسم، یہ جو کلام پیش کرتے ہیں اس میں ایک طرح کی شیرینی ہے، اس کی جڑیں پھیلی ہوئی اور مستحکم ہیں اور اس کی شاخیں ثمردار ہیں۔ ان باتوں میں سے تم لوگ جو بھی کہو گے اس کا جھوٹا ہونا واضح ہوجائے گا۔ قریب ترین بات جو کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ تم ان کے بارے میں یہ کہو کہ یہ شخص جادوگر ہے اور جو کلام پیش کررہا ہے وہ سحر ہے جو آدمی کو اس کے باپ، بھائی، بیوی اور خاندان سے جدا کردیتا ہے‘‘۔[1]

دوسرا واقعہ عتبہ بن ربیعہ کا ہے۔ وہ قریش کے بڑے سرداروں میں سے تھا۔ ایک دن اس نے قریش کی مجلس میں کہا: ’’اے قریش کے لوگو، کیوں نہ میں محمد (ﷺ) کے پاس جاکر ان سے بات کروں اور ان کے سامنے کچھ تجویز رکھوں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ

---

[1] سیرت ابن ہشام، ۱/۲۸۳-۲۸۴

ان میں سے کسی تجویز کو قبول کرلیں اور وہ ہمارے لیے بھی قابلِ قبول ہو اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آجائیں‘‘۔ قریش نے اس بات سے اتفاق کیا۔ اس موقع پر حضور مسجدِ حرام ہی میں ایک طرف تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ عتبہ قریش کی مجلس سے اٹھ کر آپؐ کی خدمت میں پہنچا اور آپؐ سے مفصل گفتگو کی۔ اس نے آپ کے حسب ونسب اور شرافت کا حوالہ دیا، ’’نئے دین‘‘ کی وجہ سے خاندان اور معاشرہ میں برپا ہونے والے ’’انتشار‘‘ کا تذکرہ کیا۔ پھر آپ کے سامنے کئی تجویزیں رکھیں۔ کتبِ سیرت میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ آپؐ اس کی ساری باتیں خاموشی سے سنتے رہے۔ جب وہ خاموش ہوا تو آپؐ نے فرمایا: ’’اے ابوالولید، کیا آپ کی بات پوری ہو چکی؟‘‘ اس نے جواب دیا: ’’ہاں‘‘ آپؐ نے فرمایا: ’’اب میری بات غور سے سنیں۔‘‘ اس کے بعد آپؐ نے سورۂ حم السجدہ کی تلاوت فرمائی اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے زمین پر ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ یہاں تک کہ جب آیتِ سجدہ (۳۸) پر پہنچے تو آپؐ نے سجدہ کیا، پھر فرمایا: ’’اے ابوالولید، آپ نے سن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام‘‘۔ عتبہ وہاں سے اٹھ کر اپنے سرداروں کے پاس پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی لوگ کہنے لگے: ’’بخدا عتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے‘‘۔ وہ وہاں پہنچا تو لوگوں نے کہا: ’’عتبہ کیا خبر لائے ہو؟‘‘ اس نے کہا:

> ’’اللہ کی قسم، میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ کبھی اس سے پہلے نہ سنا تھا۔ اللہ کی قسم نہ وہ شعر ہے، نہ جادو، نہ کہانت۔ اے گروہِ قریش۔ میری بات کو تسلیم کرو اور میری رائے پر عمل کرو۔ میری تجویز یہ ہے کہ اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ بخدا جو کلام میں نے سنا ہے وہ ضرور رنگ لا کر رہے گا‘‘[1]

یہ چیلنج رہتی دنیا تک کے لیے ہے:

قرآن کے اس چیلنج کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں، مگر اس کا جواب دینے کی آج تک کوئی شخص ہمت نہیں کرسکا۔ تاریخ میں بعض لوگوں کا نام آتا ہے جو قرآن کے مثل کلام پیش کرنے کے لیے آمادہ ہوئے، اس کے لیے کوشش بھی کی، مگر بالآخر انہیں ناکامی

---

[1] سیرت ابن ہشام، ۳۱۳-۳۱۴

کا منھ دیکھنا پڑا۔

نزولِ قرآن کے زمانے کے اہلِ عرب عربی زبان کے معاملے میں اصل اور حجت ہیں۔ وہ فصاحت و بلاغت پر پوری طرح قادر اور عربی زبان کے اسرار و رموز سے بخوبی واقف تھے۔ جب تمام تر دواعی و محرّکات اور زبانی دعووں کے باوجود وہ قرآن کے مثل کوئی کلام پیش نہ کر سکے تو بعد کے لوگوں کے لیے اس کا معارضہ کرنا بداہۃً ناممکن ہے۔

قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کے دلائل:

قرآن کے اس چیلنج سے ہٹ کر بہت سی داخلی اور خارجی شہادتیں ہیں جو اسے الٰہی کلام ثابت کرتی اور اس کے کسی انسانی کاوش کا ثمرہ ہونے کی نفی کرتی ہیں۔ [1]

(۱) اسلوب، ادب اور نظمِ کلام

قرآن کریم جس زبان میں نازل ہوا ہے اس کے ادب کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس میں موسیقیت اور نغمگی ہے، لیکن وہ شاعری کی قبیل کی کوئی چیز نہیں۔ وہ نثر ہے، لیکن کاہنوں کے کلام کی طرح پر تکلف، مسجّع اور مبہم نہیں۔ اس میں انتہائی سلاست و روانی اور بلا کی تاثیر پائی جاتی ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار پر ہے۔ اس کی سحر انگیزی نے سخت ترین مخالفوں تک کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اس میں مختلف مضامین موزوں ترین الفاظ اور جملوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ ایک ایک لفظ نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے کہ اگر اسے اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو کلام میں خلل آ جائے۔ جو مضامین بار بار آئے ہیں ان کے لیے بھی ہر جگہ نیا اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے جس سے سننے والے کو گرانی نہیں ہوتی اور اس تبدیلی سے نئے نئے معانی مستنبط ہوتے ہیں۔ ہر زبان میں زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف طرح کی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ بہت سے الفاظ، اسالیب اور محاورے متروک ہو جاتے ہیں۔ قواعد اور معیارات بدل جاتے ہیں۔ لیکن چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود قرآن کی زبان اب بھی معیاری

---

[1] اعجازِ قرآنی کے موضوع پر علمائے اسلام نے بہت کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے بہت سے وجوہِ اعجاز کی نشان دہی کی ہے۔ یہاں ان میں سے چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اور ٹکسالی سمجھی جاتی ہے اور اس کا کوئی لفظ، کوئی اسلوب اور کوئی محاورہ متروک نہیں ہوا ہے۔ اس وصف کے اظہار کے لیے قرآن میں ”آیات مبیّنات “ (النور-۴۶) ”کتاب مبین “ (المائدہ-۱۵) ”قرآن مبین “ (الحجر-۱) بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُبِیْنٍ “ (الشعراء-۱۹۵) اور قُرْآناً عَرَبِیّاً غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ (الزمر-۲۸) جیسے الفاظ آئے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کوئی انسانی کلام ان خصوصیات کا حامل نہیں رہا ہے۔

(۲) موضوعات کی وسعت:

قرآن میں جن موضوعات سے بحث کی گئی ہے ان کا احاطہ کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں۔ یہ بھی دلیل ہے اس بات کی کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ یہ کائنات کیوں بنائی گئی ہے؟ اس میں انسان کا مقام کیا ہے؟ اور اس سے کون سا رویّہ مطلوب ہے؟ وہ اپنی خواہشات، ارادوں اور اعمال کا مالک و مختار ہے یا کسی کے سامنے جواب دہ ہے؟ اگر جواب دہ ہے تو کس کے سامنے؟ ان سوالات کے اس میں بہت واضح اور تفصیلی جوابات دیے گئے ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس کائنات کو ایک ہستی نے منصوبہ بند طریقے پر وجود بخشا ہے۔ اور اس میں انسان کو آزمائش کے لیے بھیجا ہے کہ وہ اس میں اپنے اور اس پوری کائنات کے خالق و مالک کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلتا ہے یا غلط راستوں پر جا پڑتا ہے۔ سیدھا راستہ کیا ہے اور غلط راستے کون کون سے ہیں؟ اسے بھی بہت کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور اس پر کائنات کے مختلف مظاہر، خود انسان کے اپنے وجود اور پوری انسانی تاریخ سے دلائل فراہم کیے گئے ہیں۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پچھلے زمانوں میں انسان کس کس طرح غلط راستوں پر چلتا رہا ہے اور کن ذرائع سے اس کی صحیح راستے کی طرف رہنمائی کی جاتی رہی ہے؟ اسی طرح اس میں اس موضوع پر بھی بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ صحیح راستے کو اختیار کرنے اور غلط راستوں پر چلنے والوں پر اس دنیا میں کیا اثرات اور نتائج مرتب ہوتے ہیں اور اس دنیا کے فنا ہو جانے کے بعد جب ایک دوسری دنیا وجود میں آئے گی تو اس میں ان کے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے؟

ان موضوعات پر اور ان جیسے دیگر اور بہت سے موضوعات پر قرآن میں بہت واضح اور قطعی انداز میں بحث کی گئی ہے۔ جو معلومات پیش کی گئی ہیں وہ محض قیاسات، اندازوں اور گمان پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ انہیں پیش کرنے والا قطعی اور یقینی علم رکھتا ہے۔ ماضی پر بھی اس کی نظر ہے اور مستقبل بھی پوری طرح اس پر عیاں ہے۔

(۳) بیانات کی صداقت:

قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس میں اس کے زمانۂ نزول میں، آئندہ پیش آنے والے بعض واقعات کی خبر اتنے جزم و یقین اور قطعیت کے ساتھ دی گئی کہ ظاہری حالات میں کوئی انسان ویسی پیشین گوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ قرآن میں اس طرح کے متعدد واقعات مذکور ہیں جن میں سب سے زیادہ نمایاں غلبۂ روم کی پیشین گوئی ہے۔ سورۂ روم کے آغاز میں ہے:

الٓمّٓ، غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ. فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ (آیات:۱-۴)

ا-ل-م- رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں۔ اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔

عرب سے متصل رومی مقبوضات پر آتش پرست ایرانیوں کا غلبہ ۶۱۵ء میں مکمل ہوا تھا۔ شہنشاہِ ایران خسرو پرویز نے بہت سے رومی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا، لاکھوں عیسائیوں کو تہِ تیغ کر دیا تھا، بہت سے گرجوں کو مسمار کر دیا تھا اور پوری مسیحی دنیا میں قیامت برپا کر دی تھی۔ ان حالات میں قرآن نے پیشین گوئی کی کہ چند سال (بضع سنین) میں رومیوں کو پھر غلبہ حاصل ہو جائے گا (عربی زبان میں بضع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے) اس وقت اِس پیشین گوئی کے پورا ہونے کے آثار دُور دُور تک نہ تھے۔ رومیوں کی مغلوبیت بڑھتی چلی جا رہی تھی اور رومی مقبوضات یکے بعد دیگرے ایران کے قبضے میں جا رہے تھے۔ انگریز مورخ گبن نے لکھا ہے کہ ”قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کے بعد بھی سات آٹھ برس تک حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور نہ کر سکتا تھا کہ رومی سلطنت

ایران پر غالب آجائے گی، بلکہ غلبہ تو درکنار اس وقت تو کسی کو یہ امید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ پائے گی‘‘۔ لیکن واقعات شاہد ہیں کہ قرآن کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ شہنشاہِ روم ہرقل نے اپنا جوابی حملہ ۶۲۳ء میں ارمینیاہ سے شروع کیا اور دوسرے سال اس نے اذربیجان میں گھس کر زرتشت کے مقامِ پیدائش ارمیاہ کو تباہ کردیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔[1]

اسی طرح کی ایک پیشین گوئی عہدِ موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کی لاش کے بارے میں قرآن میں ملتی ہے:

فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوْنَ لِمَنْ خَلْفَکَ آیَةً (یونس-۹۲)

اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنے۔

یہ بات فرعون کے دریا میں ڈوبتے وقت یعنی نزولِ قرآن سے صدیوں قبل کہی گئی تھی۔ قرآن میں اسے نقل کیا گیا تو اس وقت بھی اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ اس پیشین گوئی کی صداقت کا اظہار اس وقت ہوا جب بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں مصر میں عہدِ فراعنہ کے بنے ہوئے اہراموں اور ان میں موجود قبروں اور تابوتوں کو کھولنے کا کام شروع کیا گیا اور عہدِ موسیٰ میں ڈوبنے والے فرعون کی لاش کی ممی پائی گئی (اسے قاہرہ کے میوزیم میں محفوظ کردیا گیا ہے)

پیشین گوئیوں سے ہٹ کر کائنات کے مختلف مظاہر کے بارے میں قرآن نے چودہ سو سال پیش تر جو بیانات دیے تھے ان کی معنویت اور صداقت زمانہ گزرنے کے ساتھ آشکارا ہورہی ہے۔ اس وقت کے انسان کا مبلغِ علم اتنا تھا ہی نہیں کہ ان کا مفصل اور دقیق ادراک کرسکے۔ آسمانوں اور زمین کی تخلیق، پہاڑوں کی بناوٹ، ہواؤں، بادلوں اور بارش کے مظاہر، انسانوں کی تخلیق اور دیگر امور کے سلسلے میں جو بیانات قرآن میں مذکور ہیں، آج سے چودہ سو سال پہلے کا کوئی انسان اتنی صحت اور باریکی کے ساتھ انہیں پیش ہی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ بیانات شاہد ہیں کہ انہیں پیش کرنے والی وہ ذات ہے جو حقائق کا براہِ راست علم رکھتی ہے اور اس کے لیے زمان و مکان کی قید بے معنی ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن، مولانا مودودی ۳/۷۲۴ـ۷۲۸ (بہ تلخیص)

(۴) یکسانی اور عدمِ اختلاف:

قرآن کریم تیئس (۲۳) سال تک حسبِ ضرورت تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔ اس عرصے میں مسلمان مختلف حالات سے دوچار رہے۔ دس سالہ مکی دور میں وہ کمزور اور مظلوم تھے۔ اس دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں اسلام کی بنیادی تعلیمات پیش کی گئیں، خاص طور پر عقائد اور ایمانیات کی وضاحت کی جاتی رہی۔ اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات اور شبہات کے جوابات دیے گئے۔ اور مخالفوں کی جانب سے پہنچنے والی اذیتوں پر صبر اور اعراض کی تلقین کی جاتی رہی۔ مدینہ ہجرت کرنے کے بعد جب مسلمانوں کو استحکام نصیب ہوا اور ان کی آزاد ریاست قائم ہوئی تو اس کے مطابق معاشرتی اور تمدنی احکام دیے گئے اور دشمنوں کے ساتھ برپا جنگ کے حالات میں ان کی رہنمائی اور ان کی کم زوریوں کی نشان دہی کی جاتی رہی۔ ان مختلف اور متضاد حالات میں نازل ہونے کے باوجود قرآن کے تمام اجزاو باہم مربوط اور ہم آہنگ نظر آتے ہیں اور اس کے مضامین میں اختلاف اور تضاد کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو مختلف حالات میں، اس کی رایوں میں ہونے والی تبدیلیوں، مستقبل کے بارے میں اس کے اندازوں کی غلطیوں اور حالات کے زیر اثر اس کے بدلتے رجحانات و میلانات کا عکس اس میں ضرور نظر آتا۔

قرآن نے اس حقیقت کو، اس کے کلام اِلٰہی ہونے کے ایک ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے:

> اَفَلاَ یَتَدَبَّرُونَ القُرْآنَ، وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوا فِیہِ اخْتِلافاً کَثِیْراً (النساء۔ ۸۲)
>
> کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔

اس آیت کی تفسیر میں امام قرطبیؒ نے ایک قول یہ نقل کیا ہے:

”کسی شخص کے کلام کی مقدار جب زیادہ ہوتی ہے تو اس میں اختلاف بھی

کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اس کے بیانات، الفاظ اور معانی میں فرق آ جاتا ہے۔ ان میں تناقض در آتا ہے اور اس کی بہت سی خبریں مطابقِ واقعہ نہیں ثابت ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا اور لوگوں کو اس میں غور و تدبر کرنے کا حکم دیا۔ اس لیے اگر وہ اس میں غور کریں گے تو انہیں اس کے بیانات میں کوئی اختلاف، معانی میں کوئی تفاوت، مضامین میں کوئی تضاد اور غیب کی خبروں کے بارے میں کوئی غلط بیانی نہ ملے گی‘‘[1]

(۵) احادیث کے مختلف اسلوب:

اللہ کے رسول ﷺ اہلِ مکہ کے درمیان پروان چڑھے۔ نبوت کے بعد بھی ان کے ساتھ آپ کا اٹھنا بیٹھنا اور ملنا جلنا رہا۔ وہ آپ کی بول چال اور اندازِ گفتگو سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے سامنے جب آپؐ نے قرآن کی آیات پیش کیں تو انہیں یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ یہ کلام ان باتوں سے مختلف ہے جو وہ اب تک آپ کے منھ سے سنتے آرہے ہیں۔ آپ اپنی گفتگوؤں اور خطبوں کے درمیان قرآنی آیات پڑھتے تھے تو ہر شخص دونوں کے انداز میں فرق صاف محسوس کر لیتا تھا۔ آپؐ کے ارشاداتِ عالیہ کا بڑا ذخیرہ کتبِ احادیث میں محفوظ ہے۔ آج بھی قرآنی آیات سے ان کا موازنہ کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ موضوعات اور مباحث کی یکسانیت اور وحدت کے باوجود دونوں کے اسالیب میں بیّن فرق ہے اور ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔

قرآن اور احادیث دونوں کے اسالیب کا مختلف ہونا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ دونوں کا سرچشمہ کوئی ایک ذات نہیں ہو سکتی۔ کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ دو بالکل مختلف اسالیب میں کلام کر سکے۔ اور اگر وہ بہ تکلف ایسا کرنے کی کوشش کرے تو اس بات کا قطعی امکان نہیں ہے کہ وہ گھنٹے دو گھنٹے، ایک دن دو دن نہیں، بلکہ مسلسل تیئس (۲۳) سال تک اس تکلف کو نباہتا رہے، لیکن کسی دوسرے پر یہ راز منکشف نہ ہو سکے۔

---

[1] تفسیر قرطبی ۵/۲۹۰

(۶) ایک اُمّی کی زبان سے ادائیگی:

قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ایک امّی کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے تھے۔ اس بنا پر قرآن میں آپ کی ایک صفت ''امّی'' بیان کی گئی ہے (الاعراف:۱۵۷)۔ اس میں بہت بڑی حکمت تھی۔ اگر آپ پڑھنا لکھنا جانتے ہوتے تو لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ آپ جو کچھ قرآن کی صورت میں پیش کررہے ہیں اسے پہلے کی کتابوں سے اخذ کرلیا ہے۔ قرآن نے اس چیز کو بھی بطور ایک دلیل کے پیش کیا ہے:

> وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ كِتَابٍ وَّ لاَ تَخُطُّهُ بِيَمِنِكَ اِذاً لاَّرْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ(العنکبوت۔۴۸)
>
> (اے نبی) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔

قرآن میں گزشتہ قوموں کی تاریخ، ان کے تمدن اور عقائد وافکار، ان کی طرف بھیجے جانے والے پیغمبروں کے حالات، ان کے ساتھ ان قوموں کے رویوں اور ان کے انجام پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان باتوں کا علم حاصل کرنے کا، اللہ کے رسول ﷺ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اور نہ ان کے بارے میں آپ کی قوم تفصیلی معلومات رکھتی تھی۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ قرآن کو آپؐ نے گھڑ کر نہیں پیش کیا ہے اور نہ بالواسطہ کسی سے یہ معلومات اخذ کی ہیں، بلکہ یہ وحی ہے جسے آپ پر نازل کیا گیا ہے۔ سورۂ ہود میں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان پیش آنے والے واقعات کی تفصیل کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا(ہود۔۴۹)
>
> اے نبی، یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہاری طرف وحی کررہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم۔

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت مریم کے واقعات بیان کرتے ہوئے قرآن صراحت کرتا ہے کہ اے محمد (ﷺ) جب یہ واقعات رونما ہو رہے تھے تو اس وقت تم وہاں موجود نہیں تھے۔ یہ تو غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں (یوسف ۔۱۰۲، قصص: ۴۴۔۴۶، آل عمران ۔۴۴)

صرف یہی نہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ خود پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے، بلکہ جو لوگ اس فن سے آشنا تھے اور قدیم تاریخ کا کچھ علم رکھتے تھے، ان سے بھی آپؐ کی ملاقات اور اخذ واستفادہ کا کوئی ثبوت نہیں ہے آپؐ کی قوم کو آپؐ کے احوال کی پوری خبر تھی۔ نبوت سے قبل آپؐ نے تجارت کی غرض سے بعض علاقوں کے جو اسفار کیے تھے وہ بھی تجارتی قافلوں کے ساتھ کیے تھے۔ اگر مکہ میں رہتے ہوئے یا اسفار کے دوران کبھی کسی موقع پر آپ کی کسی یہودی یا عیسائی عالم سے ملاقات تک ہوئی ہوتی تو آپ کے مخالفین رائی کو پربت بنانے میں ذرا دیر نہ کرتے، مگر ہزار خواہشات کے باوجود ان میں سے کوئی شخص ایک ثبوت بھی ایسا نہ پیش کر سکا جس سے معلوم ہوتا کہ ان معلومات کے حاصل کرنے کا آپ کے پاس وحی کے علاوہ اور کوئی ذریعہ تھا۔

☆ ☆ ☆

عصرِ حاضر میں قرآن کریم کی معنویت

قرآن کریم کے بارے میں بعض حضرات کہتے ہیں کہ اسے آئے ہوئے چودہ سو سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ زمانہ بدل گیا، حالات میں تبدیلی آ گئی، صدیوں کے تجربات نے انسانوں کو زندگی گزارنے کی نئی نئی راہیں سجھائیں اور ان کی معلومات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوگیا۔ اس صورت حال میں چودہ سو سال پہلے کی کوئی کتاب آج کے دور میں انسانوں کو کیا رہنمائی فراہم کرسکتی ہے؟! یہ صحیح ہے کہ قرآن نے اپنے زمانۂ نزول میں ایک انقلاب برپا کردیا تھا۔ اس نے تہذیب وتمدن سے ناآشنا قوم کی کایا پلٹ کرکے انہیں تہذیب کا معمار بنادیا تھا اور ان لوگوں نے اس کا پرچم بلند کرکے متمدن دنیا کے بڑے حصے کو اپنے زیرِ نگین کرلیا تھا۔ لیکن آج کے ترقی یافتہ دور میں اس کی معنویت ختم ہوگئی ہے، وہ فرسودہ ہوگیا ہے اور اس کی حیثیت محض ایک تاریخی کتاب کی ہوکر رہ گئی ہے۔

قرآن کے بارے میں یہ خیالات عقل ومنطق کی اساس پر قائم نہیں ہیں اور دلائل کی قوت سے محروم ہیں۔ ان کے پیچھے نری سطحیت کارفرما ہے۔ سطورِ ذیل میں ان کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

ہر پرانی چیز فرسودہ اور بے کار نہیں ہوتی:

محض یہ بات کہ قران کو ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے، یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں کہ اب اس کی کوئی افادیت باقی نہیں رہی اور اس کا زمانہ گزر گیا ہے۔ اس کائنات میں بے شمار چیزیں ہیں جو ہزارہا سال سے موجود ہیں۔ اس کے باوجود پہلے

کی طرح اب بھی فائدہ پہنچا رہی ہیں۔ سورج ہزاروں سال سے ضیاپاشیاں کر رہا ہے۔ اس کی روشنی اور حرارت سے انسانوں کے بے شمار منافع وابستہ ہیں۔ ہوا اور پانی پر ابتدائے آفرینش سے جان داروں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ پیڑ پودے، پھل پھول اور اناج وغیرہ زمانۂ قدیم سے انسانوں اور جانوروں کو روزی بہم پہنچا رہے ہیں۔ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ان میں سے کسی چیز کی افادیت میں ذرا بھی کمی نہیں آئی ہے۔ کوئی سلیم الطبع شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ چوں کہ یہ سب چیزیں صدیوں پرانی ہوگئی ہیں اس لیے اب کام کی نہیں رہی ہیں اور آج کے دور میں ان کی افادیت ختم ہوگئی ہے۔

دلیلِ کم نظری قصۂ جدید وقدیم:

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ کسی چیز کو پرانا یا نیا، انسان اپنے اعتبار سے قرار دیتا ہے۔ وہ دن، ماہ اور سال کا شمار کرتا ہے اور اس کے حساب سے کسی چیز پر اس کے پرانے ہونے یا نہ ہونے کا حکم لگاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے پیمانے مختلف ہیں۔ جو مدت انسانوں کے نزدیک ہزاروں سال پر مشتمل ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک دن یا چند دنوں کے برابر ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں اس حقیقت کو واشگاف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول کو جھٹلانے والے کہتے تھے کہ کہاں ہے وہ عذاب جس کی تم عرصہ سے دھمکی دے رہے ہو؟ اسے لے کیوں نہیں آتے؟ انہیں جواب دیا گیا کہ اللہ کا وعدہ ضرور پورا ہوگا، لیکن اس کے معاملات کو اپنے پیمانوں سے ناپنے کی کوشش نہ کرو۔ جو مدت تمہارے نزدیک ہزار سال کو محیط ہوتی ہے وہ اللہ کے نزدیک صرف ایک دن کے برابر ہے:

وَيَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ، وَاِنَّ يَوماً عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّوْنَ (الحج۔ ۴۷)

یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا، مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے۔

آیتِ بالا میں ایک ہزار سال کو اللہ کے نزدیک ایک دن کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ معارج آیت ۴ میں ایک دن کی مقدار پچاس ہزار سال بتائی ہے۔ یہ برابری تقریبِ فہم کے لیے محض تمثیل ہے [1] آج اس حقیقت کا ادراک بہت آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ اس کرۂ ارض پر ایک دن کا اطلاق اس مدت پر ہوتا ہے جس میں زمین اپنے محور پر ایک مرتبہ گردش کرلیتی ہے۔ یہ مدت چوبیس گھنٹے کی ہوتی ہے۔ کائنات میں بہت سے ایسے سیارے ہیں جنہیں اپنے محوز پر ایک گردش مکمل کرنے میں مذکورہ مدت سے کئی ہزار گنا زیادہ وقت لگتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان ستاروں کا ایک دن زمین کے ایک دن کے مقابلے میں کئی ہزار گنا زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت مبرہن ہوجاتی ہے کہ دنوں کو ناپنے کے پیمانے مختلف ہوسکتے ہیں ۔[2]

اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے:

چیزیں انسانوں کے لیے اس لیے پرانی اور بے فائدہ ہوجاتی ہیں کیوں کہ ان کا علم ناقص اور عقل محدود ہوتی ہے۔ انہیں نہ ماضی کا صحیح اور یقینی علم حاصل ہوتا ہے اور نہ مستقبل ان کی نگاہوں میں ہوتا ہے۔ وہ صرف حال کو سامنے رکھ کر اپنے منصوبے بناتے اور خاکے ترتیب دیتے ہیں۔ چناں چہ حالات وظروف تبدیل ہوجانے اور نئے حالات پیدا ہوجانے سے ان کی چیزیں فرسودہ ہوجاتی ہیں اور ان کی افادیت باقی نہیں رہتی ۔

اللہ تعالیٰ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا علم لامحدود ہے۔ قرآن کہتا ہے:

اِنَّمَا اِلٰهُكُمُ الَّذِی لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا (طه۔۹۸)

تمہارا خدا تو بس ایک ہی اللہ ہے۔ ہر چیز پر اس کا علم حاوی ہے۔

سورۂ طلاق میں ہے:

وَ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (الطلاق۔۱۲)

اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے

وہ کھلی چھپی ہر چیز سے باخبر ہے **(عالم الغيب و الشهادة)** زمین اور آسمانوں

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۱۸/۲۸۳

[2] سید قطب، فی ظلال القرآن، جزء ۲۹، ص: ۱۰۳

میں کہیں کوئی چیز ہو اور وہ لوگوں کی نگاہوں سے مستور ہو، لیکن اللہ کو اس کی پوری خبر ہے، حتیٰ کہ وہ دلوں کے اسرار تک سے واقف ہے:

اِنَّ اللّٰہَ عٰلِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، اِنَّہٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (فاطر۔۳۸)

بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ چیز سے واقف ہے۔ وہ تو سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔

انسانوں کے علم کو علم الٰہی سے کوئی نسبت نہیں ہے:

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (الاسراء۔۸۵)

تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے۔

انہیں صرف انہی چیزوں کا علم ہو پاتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ واقف کرانا چاہے، لیکن ان کے تمام احوال اور ان کی تمام جزئیات کا وہ مکمل علم رکھتا ہے:

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖ اِلَّا بِمَا شَاءَ (البقرۃ۔۲۵۵)

جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفتِ ادراک میں نہیں آسکتی، الّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔

جس ذات کا علم اس قدر ہمہ گیر، جزرس اور ہر چیز کو محیط ہو اس کی نازل کی ہوئی کتاب پر کہنگی کا کوئی اثر کیوں کر آسکتا ہے؟ اور اس کے بیانات کیوں کر غلط یا فرسودہ ہو سکتے ہیں؟

قرآن کا موضوع انسان ہے:

اس کائنات میں انسانوں کی تخلیق کا مقصد کیسا ہے؟ یہ عناصر کے باہم فعل و انفعال کے نتیجے میں دفعۃً وجود میں آگئی ہے، یا اس کے پیچھے کسی خلاّق کی صناعی کار فرما ہے؟ اس سے انسان کا کیا رشتہ ہے؟ اس کے مختلف مظاہر انسان کی خدمت پر مامور اور اس کے لیے مسخّر ہیں یا اس کے آقا اور معبود ہیں؟ اس دنیا میں انسان کو کیسی زندگی گزارنی

چاہیے؟ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے یا کسی دوسرے کے اوامر و ہدایات کا پابند ہے؟ کائنات اور انسان کے سلسلے میں یہ اور ان جیسے دیگر سوالات ابتداء ہی سے غور و فکر کا موضوع رہے ہیں اور اب بھی ان کی معنویت ختم نہیں ہوئی ہے۔ مختلف مذاہب اور نظریات نے اپنے اپنے اعتبار سے ان کا جواب دینے کی کوشش کی ہے اور فلاسفہ و مفکرین نے انہیں حل کرنے میں سر کھپایا ہے۔ قرآن بھی ان موضوعات سے بحث کرتا اور ان کے اطمینان بخش اور قرینِ عقل جوابات دیتا ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن کا موضوع انسان ہے۔ اور جب تک یہ کائنات قائم و دائم اور اس میں انسان کا وجود باقی ہے، قرآن کے پیش کردہ یہ مباحث از کار رفتہ نہیں ہو سکتے۔

قرآن انسانی فطرت کو مخاطب بناتا ہے۔ وہ اس کے سامنے دینِ حق پیش کرتا ہے۔ انفس و آفاق سے اس پر دلائل لاتا ہے۔ تاریخ کو گواہ بناتا ہے اور اس کو دینِ حق سے انحراف کے انجامِ بد سے ڈراتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ انسان کے دل کی آواز ہے۔ اس کی فطرت اسی کا تقاضا کرتی ہے۔ اس سے روگردانی دراصل اپنی فطرت سے بغاوت ہے:

> فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ، ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (الروم۔ ۳۰)
>
> پس یک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو۔ قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے۔

قرآن کی تعلیمات ابدی ہیں:

قرآن میں انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے جو احکام اور تعلیمات دی گئی ہیں ان کی ہر زمانے میں اہمیت ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی قدر و قیمت اور اہمیت میں کچھ کمی نہیں واقع ہوتی۔ اس نے عقائد کی درستگی پر زور دیا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کی معقولیت پر دلائل قائم کیے ہیں۔ شرک و بت پرستی اور اسلامی عقائد سے متصادم

دیگر عقائد پر تنقید کی ہے اور انہیں انسانی عظمت و شرف، نظامِ کائنات اور عدل و انصاف کے منافی قرار دیا ہے۔ اس نے اللہ وحدہ لاشریک کو عبادت کا مستحق ٹھہرایا ہے اور اس کے طریقوں کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ اس نے علم حاصل کرنے اور عقل سے کام لینے پر بہت زور دیا ہے۔ اس کا بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ وہ اچھے اخلاق، مثلاً سچائی، دیانت و امانت، ایفائے عہد، احسان، رحم دلی، عفو درگزر، سخاوت، عفت و پاک بازی، حیا، عدل و انصاف، تواضع، ایثار، خوش کلامی وغیرہ کی ترغیب دیتا ہے اور برے اخلاق مثلاً جھوٹ، بد دیانتی و خیانت، بدعہدی اور غدّاری، ظلم، غیبت، بہتان، چغل خوری، بدگمانی، چوری، سود خوری، رشوت، ناپ تول میں کمی، حرص و بخل، بغض، غرور، ریا، حسد اور فحش گوئی وغیرہ کی مذمّت کرتا ہے اور ان سے بچنے کی تاکید کرتا ہے۔ یہ وہ تعلیمات ہیں جن کی اہمیت گزشتہ زمانوں کی طرح آج بھی تسلیم شدہ ہے اور ان پر عمل کرکے آج کا دور بھی امن و سکون، سعادت اور خوش حالی سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔

قرآن کی کوئی بات غلط ثابت نہیں ہوئی ہے:

قرآن کو نازل ہوئے چودہ سو سال ہو گئے ہیں۔ اس عرصہ میں انسانی علم میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ بہت سے حقائق جو سر بستہ راز تھے، اب ان سے پردہ اٹھ گیا ہے۔ انسان نے بہت سے مظاہرِ کائنات کے اسباب و علل دریافت کر لیے ہیں۔ تجربات نے اسے بہت سے سابقہ تصوّرات، نظریات اور مفروضات کو بدلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ بہت سی چیزیں جو پہلے حقائق کا درجہ رکھتی تھیں، تجربات کی کسوٹی پر وہ کھری نہ اتر سکیں اور ان کی جگہ دوسری چیزوں نے لے لی ہے، لیکن یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ قرآن کی کوئی بات اور اس کا کوئی بیان آج تک غلط ثابت نہیں ہوا ہے۔ یہی نہیں بلکہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ قرآنی بیانات کی معنویت میں اضافہ ہوا ہے اور ان کی نئی نئی تعبیریں سامنے آئی ہیں۔ زمین و آسمان کی بناوٹ، روئے زمین پر پائے جانے والے حیوانات، نباتات، پہاڑ وغیرہ، ہوا، بادل، بارش، نوعِ انسانی کی تخلیق اور دیگر مظاہرِ کائنات کے بارے میں قرآن میں جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں ان کا سادہ مفہوم تو ہر زمانے میں لوگوں

کے لیے قابلِ فہم تھا، لیکن جدید دور میں سائنسی ایجادات واکتشافات کے نتیجے میں ان کی جو جزئی تفصیلات فراہم ہوئی ہیں اور ان کے جن اسباب وعلل کا علم ہوا ہے وہ کسی بھی مرحلے پر قرآنی بیانات سے متصادم نہیں ہیں۔ اس سے قرآن کا ایک اعجاز آشکارا ہوتا ہے کہ جن حقائق اور نتائج تک انسانوں کی رسائی طویل جدّ وجہد اور بہت سے تجربات کے بعد ہوئی ہے انہیں قرآن چودہ سو سال قبل بہت واضح االفاظ میں بیان کر چکا ہے۔

قرآن آج کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے:

جس زمانے میں قرآن نازل ہوا اس زمانہ کے انسان مختلف مسائل سے دوچار تھے۔ تہذیب، معاشرت، معیشت اور زندگی کے دیگر میدانوں میں وہ انتشار، انارکی، بے اطمینانی، استحصال اور ظلم کا شکار تھے۔ قرآن نے ان کے سامنے ایک مثالی معاشرہ کا تصور پیش کیا۔ اس پر ایمان لانے اور اس کی دعوت پر لبیک کہنے والوں نے اس کی تعلیمات کو نافذ کیا تو ان کا معاشرہ امن وسکون اور عدل وانصاف کا گہوارہ بن گیا۔ آج کے دور میں بھی نت نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ انہیں حل کرنے کی انسانی کوششیں ناکام نظر آتی ہیں۔ قرآن ان مسائل کا کامیاب حل پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ مسائل پیدا ہی اس وجہ سے ہوئے ہیں، کیوں کہ انسانوں نے خدائی ہدایت سے بے نیاز ہو کر زندگی گزارنے کے اصول وقوانین خود وضع کر لیے ہیں۔ ان مسائل کی گتھیاں اس وقت تک سلجھ ہی نہیں سکتیں جب تک کہ وہ خدائی احکام اور ہدایات کے مطابق زندگی نہ گزاریں۔

☆ ☆ ☆

کیا قرآن مخالفوں سے لڑنے اور انہیں قتل کرنے کا حکم دیتا ہے؟

اسلام پر اس کے مخالفین جو اعتراضات کرتے ہیں، ان میں ایک بڑا، بلکہ شاید سب سے بڑا اعتراض، اس کے تصور جہاد پر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام ایک خوں آشام مذہب ہے۔ وہ طاقت کے بل پر اپنا غلبہ اور نفاذ چاہتا ہے۔ اس کے پیرو کار جھگڑالو طبیعت کے ہوتے ہیں۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے ہمیشہ لڑنا جھگڑنا ان کا کام رہتا ہے۔ اس ضمن میں بعض معترضین اس کا ذمہ دار قرآن کو قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن غیر مسلموں کو ناپاک، جہنمی اور قابلِ نفرت کہتا ہے اور مسلمانوں کو ان کے ساتھ سختی سے پیش آنے، ان سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنے، ان کے ساتھ جنگ کرنے اور انہیں قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اس لیے جب تک قرآن موجود ہے اس وقت تک دنیا میں بقائے باہم اور امن وامان کی فضا قائم نہیں ہوسکتی۔ قرآن کے بارے میں انہی خیالات کا نتیجہ ہے کہ کبھی ان مخالفین کی جانب سے عدالت کے ذریعے اس پر پابندی عائد کروانے کی کوشش کی جاتی ہے، کبھی شارعِ عام پر اس کے نسخے جلائے جاتے ہیں اور کبھی دیگر ذرائع سے اس کے خلاف نفرت اور غصہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔

غیر مسلموں سے تعلقات کے ضمن میں قرآن کریم کے احکام وتعلیمات اور اس کے تصورِ جہاد وقتال کے بارے میں یہ غلط فہمی دراصل ان احکام وتعلیمات کو صحیح تناظر میں نہ دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ سطورِ ذیل میں اس پہلو پر کچھ روشنی ڈالنے اور مذکورہ آیاتِ قرآنی کے صحیح موقع ومحل کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اسلام جبر واکراہ کا مخالف ہے:

یہ بات حقیقت سے بعید تر ہے کہ اسلام طاقت کے ذریعے اپنا غلبہ چاہتا ہے اور بہ زور لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ کسی بھی نظریہ یا عقیدہ پر اطمینان کا تعلق اصلاً دل سے ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اسے دل کی آمادگی کے ساتھ، کھلے ماحول میں، بغیر کسی خوف، لالچ یا دباؤ کے، قبول کیا جائے۔ قرآن میں یہ بات بہت زور دے کر کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے سامنے حق واضح کر دیا ہے اور انہیں بتا دیا ہے کہ اسے قبول کرنے پر وہ اس دنیا میں اور اس کے بعد آنے والی دنیا میں کن سعادتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔ اور اسے نہ قبول کرنے کی صورت میں ان کا انجام کیا ہوگا؟ لیکن ساتھ ہی اس نے انہیں ارادہ واختیار کی آزادی بخشی ہے کہ وہ چاہیں تو اسے قبول کر کے دائرۂ اسلام میں آجائیں اور چاہیں تو کفر کی روش پر قائم رہیں۔ یہ مضمون قرآن میں بہ تکرار آیا ہے:

سورۂ کہف میں ہے:

وَقُلِ الحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (آیت: ۲۹)

صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے۔ اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔

سورۂ الدہر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (آیت: ۳)

ہم نے اسے راستہ دکھا دیا۔ خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔

حق کو واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر بھیجے۔ انہوں نے انسانوں تک ان کے رب کا پیغام پہنچایا۔ صحیح کیا ہے اور غلط کیا؟ کن کاموں کا اللہ نے حکم دیا ہے اور کن کاموں سے روکا ہے؟ کن چیزوں سے وہ خوش ہوتا ہے اور کون سی چیزیں اس کے غضب کو بھڑکاتی ہیں؟ انہوں نے ایک ایک بات شرح وبسط سے بیان کر دی ہے۔ اب حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے میں کوئی دشواری اور ذرا سا بھی ابہام نہیں رہ گیا ہے۔ اس لیے قرآن بہ تاکید کہتا ہے کہ دین کے معاملے میں لوگوں کے ساتھ زور زبردستی کا

معاملہ قطعاً نہ کیا جائے اور انہیں پوری آزادی دی جائے کہ چاہیں راہ راست پر چلیں یا گمراہی میں پڑے رہیں:

> **لَاۤاِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ. قَدْتَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الغَیِّ (البقرۃ-۲۵۶)**
>
> دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔

اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی شدید خواہش تھی کہ اللہ کے سارے بندے دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہو جائیں۔ آپ ان کے سامنے حکمت کے ساتھ اسلام کی دعوت پیش کرتے۔ انہیں ہر ممکن طریقے سے سمجھاتے اور ایمان کے ثمرات اور کفر کے ہولناک نتائج سے باخبر کرتے۔ لیکن کفار کا، ضد، ہٹ دھرمی اور سرکشی و نافرمانی کا رویّہ آپ ؐ کو حزن و غم میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اس لیے آپ کو تسلی دی گئی کہ جو لوگ ایمان قبول نہیں کر رہے ہیں ان کے غم میں خود کو ہلکان نہ کرو۔ تمہاری ذمہ داری تمام انسانوں کو بہ جبر مومن بنا دینا نہیں ہے، بلکہ تمہارا کام صرف حق کی تبلیغ ہے۔:

> **وَلَوْشَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا. اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوا مُؤْمِنِیْنَ. (یونس-۹۹)**
>
> اگر تیرے رب کی مشیّت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مومن و فرماں بردار ہی ہوں) تو سارے اہلِ زمین ایمان لے آئے ہوتے۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟

جنگ کی اجازت ظلم و جبر کے خاتمے کے لیے دی گئی ہے:

یہ امرِ واقعہ ہے کہ ہر زمانے میں طاقت ور لوگوں نے کم زوروں کی آزادی سلب کی ہے، ان پر اپنی مرضی تھوپی ہے اور انہیں اپنا محکوم اور تابع بنانے کی کوشش کی ہے۔ صدرِ اسلام میں بھی یہی ہوا۔ جب اللہ کے رسول ﷺ نے توحید کی دعوت پیش کی اور کچھ لوگوں نے، جن میں سے بیش تر سماج کے کمزور طبقہ کے لوگ تھے، آپ ؐ کی دعوت قبول کر لی تو مکہ کے سرداروں کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے اسے اپنی سرداری کے خلاف چیلنج اور اپنے اقتدار کے خلاف بغاوت تصور کیا۔ چناں چہ انہوں نے ایمان لانے والوں پر ظلم

وستم کے تمام حربے آزمائے۔ انہیں طرح طرح سے ستایا۔ جسمانی اذیتیں دیں اور جو راہِ حق ان کم زور لوگوں نے اپنی مرضی اور پسند سے اختیار کی تھی اس سے انہیں پھیرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جب ظلم و جبر حد سے بڑھ گیا تو اہلِ ایمان اپنا وطن، گھر بار اور خویش و اقارب چھوڑ کر پہلے حبشہ، پھر مدینہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ وہاں بھی ان ظالموں نے انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ان کے خلاف دوسروں کو اکسایا اور ان کے درپے آزار رہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ وہ اب اپنے اوپر ہونے والے ظلمِ مسلسل کا جواب دے سکتے ہیں:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوا. وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْر. اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْامِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلآَّ اَن یَّقُوْلُوارَبُّنَا اللّٰہُ(الحج:۳۹-۴۰)

اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے۔ کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے"۔

اسلام اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو دفع کرنے کے لیے جنگ کی نہ صرف اجازت، بلکہ ترغیب دیتا ہے۔ اور اس پر اللہ کی بارگاہ میں بڑے اجر و ثواب کا وعدہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوا وَاُخْرِجُوا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِی سَبِیْلِی وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاُدْخِلَنَّھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الاَنْھَارُ. ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِاللّٰہِ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الثَّوَابِ

(آل عمران۔ ۱۹۵)

لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لیے لڑے اور مارے گئے، ان کے سب قصور میں معاف کردوں گا اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ سماج سے ظلم و جور کا خاتمہ ہو، تمام افراد آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں۔ وہ اپنی مرضی کے مالک ہوں۔ جس عقیدہ اور فکر کو صحیح سمجھیں اسے اپنا سکیں۔ کسی کو ان پر اپنی مرضی تھوپنے، ان کی آزادی سلب کرنے اور ان پر ظلم وتشدد کرنے کا اختیار نہ ہو۔ اسی لیے قرآن ان لوگوں کے خلاف بھی جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے جن کے ماتحت کم زور مرد، عورت اور بچے ظلم و جور کی چکی میں پس رہے ہوں اور ان سے گلو خلاصی کی کوئی صورت نہ پاتے ہوں:

وَمَالَكُمْ لَاتُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِيْرًا. (النساء ـ۷۵)

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کم زور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ جنگ کا آغاز مسلمانوں نے نہیں کیا تھا، بلکہ جنگ ان پر تھوپی گئی تھی۔ دشمنوں کا منصوبہ تھا کہ مسلمانوں کو، جو ابھی کم زور ہیں، ابتدائی مرحلے ہی میں کچل دیں اور شمعِ اسلام کو اپنی پھونکوں سے گل کر دیں۔ اس صورتِ حال میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ان کا منھ توڑ جواب دیں اور ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیں۔ لیکن اس وقت بھی انہیں تاکید کی گئی کہ ان کے ساتھ جتنی زیادتی کی گئی ہے اتنا ہی بدلہ لیں، حد سے تجاوز نہ کریں۔ درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَاتَعْتَدُوْا، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ، فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ. كَذٰلِکَ جَزَاءُ الْكَافِرِيْنَ. فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ.

وَقٰتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوا
فَلَاعُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْن . اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ
وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ . فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ
مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ
(البقرۃ: ۱۹۰_۱۹۴)

> اورتم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے لڑو جہاں بھی تمہارا ان سے مقابلہ پیش آئے اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے۔ اس لیے کہ قتل اگرچہ برا ہے، مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ اور مسجد حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں، تم بھی نہ لڑو۔ مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چوکیں تو تم بھی بے تکلف انہیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ تم ان سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔ ماہِ حرام کا بدلہ ماہِ حرام ہی ہے اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہوگا۔ لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے، تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ انہی لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

اسلام کے نزدیک جنگ کے مقابلے میں امن کو ترجیح حاصل ہے۔ وہ جنگ کا اسی وقت حکم دیتا ہے جب اس کے علاوہ سارے دروازے بند ہو گئے ہوں۔ دورانِ جنگ دشمن اگر صلح کی طرف مائل ہوں تو مسلمانوں کو ان کی پیش کش قبول کر لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ حتی کہ اگر اس پیش کش کے پسِ پردہ دشمنوں کا مقصد فریب دینا ہو تو بھی وہ تاکید کرتا ہے کہ مسلمان صلح کے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور اللہ پر توکل کرتے ہوئے اس پر رضامند ہو جائیں:

وَاِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَاوَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ . اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ . وَاِنْ يُّرِيْدُوا اَن يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ . هُوَ الَّذِىْ
اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ (الأنفال: ٦١-٦٢)

اور اے نبی، اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو، یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہوں تو تمہارے لیے اللہ کافی ہے۔ وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعے سے تمہاری تائید کی۔

آیاتِ قتال کا تعلق حالتِ جنگ سے ہے:

قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر اس طرح کی باتیں کہی گئی ہیں کہ کفار و مشرکین کو جہاں پاؤ انہیں قتل کر دو، ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ، انہیں گھیرو، ان کے لیے گھات لگاؤ وغیرہ۔ ان کا تعلق عام حالات سے نہیں ہے، بلکہ ان میں دورانِ جنگ کے سلسلے کی ہدایات دی گئی ہیں۔ جب کسی جمعیت سے جنگ برپا ہو تو میدانِ جنگ میں کوئی بھی فریق دوسرے فریق کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتتا، بلکہ ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے مخالف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہونچائے اور اس کے افراد کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں قتل کر کے اس کی فوجی طاقت پارہ پارہ کر دے۔ اس موقع پر کسی کمزوری اور نرمی کا مظاہرہ خود اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے مثل ہے۔

اس مضمون کی چند آیات درج ذیل ہیں:

سورۂ محمد میں ہے:

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ، حَتّٰٓی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ، فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً ا حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (آیت: ۴)

پس جب ان کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو، اس کے بعد (تمہیں اختیار ہے) احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کرو، تا آں کہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔

سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوا زَحْفاً فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ

(آیت : ۱۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہو تو ان کے مقابلے میں پیٹھ نہ پھیرو۔

سورۂ توبہ کے آغاز میں مسلمانوں کو ان مشرکین کے خلاف جنگ کرنے کا حکم دیا گیا جو معاہدۂ صلح و امن کے باوجود اسلام اور مسلمان کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے اور ان سے دشمنی نکالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی مسلمانوں کو تاکید کی گئی کہ ان کے خلاف بھی فوراً فوج کشی نہ کریں، بلکہ مدتِ معاہدہ پوری ہو جانے دیں:

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ (التوبة : ۵)

اسی سورت میں آگے ایک جگہ ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً (آیت : ۱۲۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تمہارے پاس ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔

مسلمانوں کی دشمنی میں ”منافقین“ بھی کسی سے کم نہ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے بعض مصالح کی بنا پر ظاہر میں اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا، لیکن حقیقت میں ان کے دل کفر پر جمے ہوئے تھے اور ان کی پوری ہمدردیاں مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ تھیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ درپردہ دشمنانِ اسلام کا ساتھ دیتے تھے۔ ان کے سلسلے میں مسلمانوں کو ہدایت دی گئی کہ انہیں اپنے گروہ کے افراد نہ سمجھیں، بلکہ ان کے ساتھ بھی دشمنوں ہی جیسا معاملہ کریں:

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ، اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ، وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ

اَوْلِيَاءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوا فِى سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوا فَخُذُوهُمْ
وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيّاً وَّلَا نَصِيْراً

(النساء: ۸۸-۸۹)

پھر یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ منافقین کے بارے میں تمہارے درمیان دو رائیں پائی جاتی ہیں، حالاں کہ جو برائیاں انہوں نے کمائی ہیں ان کی بدولت اللہ انہیں الٹا پھیر چکا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے ہدایت نہیں بخشی اسے تم ہدایت بخش دو؟ حالاں کہ جس کو اللہ نے راستہ سے بھٹکا دیا اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اسی طرح تم بھی کافر ہو جاؤ، تا کہ تم اور وہ سب یکساں ہو جائیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ، جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آ جائیں، اور اگر وہ ہجرت سے باز رہیں تو جہاں پاؤ انہیں پکڑو اور قتل کرو اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔

ان تمام آیات کا تعلق حالتِ جنگ سے ہے، عام حالات پر ان کا انطباق صحیح نہیں۔

اس طرح کے احکام دیگر مذاہب میں بھی ہیں:

جنگ ایک ناپسندیدہ لیکن ناگزیر صورت حال ہے۔ وہ اپنے ساتھ جان و مال کی ہلاکت اور بربادی لاتی ہے۔ اس کے منفی اثرات برسرِ جنگ قوموں اور اس کا شکار ہونے والے افراد پر پڑتے ہیں۔ اس کے باوجود جنگیں گزشتہ زمانوں میں بھی ہوتی رہی ہیں اور آئندہ بھی ان کے امکانات کم نہیں ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر ملک نے اپنے طور پر قوانین بنائے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر بھی اس سے متعلق قوانین وضع کیے گئے ہیں۔ مختلف مذاہب میں بھی اس کے بارے میں احکام پائے جاتے ہیں۔ جن مذاہب میں جنگ سے متعلق کسی طرح کی تعلیم نہیں ملتی ان کے پیروؤں کو بھی مختلف مواقع پر جنگ کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ ممالک کے دستوروں اور مذہبی کتابوں میں جنگ سے متعلق احکام و قوانین ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا تعلق دشمن قوم کے ساتھ عام برتاؤ سے ہے۔ بلکہ ظاہر ہے کہ ان میں جنگ کی مخصوص صورت حال کا بیان ہے۔ یہاں مثال کے طور پر

ہندومت کی مذہبی کتابوں کے چند حوالے دیے جاتے ہیں:

’’اے اندر، ہم کو بہادرانہ سطوت عطا کر، آزمودہ کاری اور اس روز افزوں قوت کے ساتھ جو مال غنیمت حاصل کرتی ہے، تیری مدد سے ہم جنگ میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کریں، چاہے وہ اپنے ہوں یا پرائے، ہم ہر دشمن پر فتح مند ہوں۔ اے بہادر ہم تیری مدد سے دونوں قسم کے دشمنوں کو قتل کر کے خوش حال ہوں، بڑی دولت کے ساتھ‘‘

(رگ وید، ۶:۱:۸-۱۳)

’’مجھ کو اپنے ہم سروں میں سانڈ بنا، مجھ کو اپنے حریفوں کا فتح کرنے والا بنا، مجھ کو اپنے دشمنوں کا قتل کرنے والا با اختیار حکمراں، مویشیوں کا مالک بنا‘‘

(رگ وید، ۱۰:۱۶۵:۱)

’’اے اگنی، ہماری مزاحمت کرنے والی جماعتوں کو مغلوب کر، ہمارے دشمنوں کو بھگا دے، اے اجیت دیوتاؤں کو نہ ماننے والے حریفوں کو قتل کر اور اپنے پجاری کو عظمت و شوکت نصیب کر‘‘ (یجروید، ۹:۳۷)

’’اے مینو، طاقت ور سے زیادہ طاقت ور ہو کر ادھر آ اور اپنے غضب سے ہمارے تمام دشمنوں کو ہلاک کر دے، دشمنوں اور ورتیروں اور دسیوں کو قتل کرنے والے۔ تو ہمارے پاس ہر قسم کی دولت اور خزانے لا‘‘ (اتھروید، ۴: ۳۲: ۱:۳)

’’اندر اور سوما، تو خبیث دشمن کو جلا دے، تباہ کر دے۔ اے دیوتا آ، جو رنج پر رنج پہنچاتے ہیں انہیں نیچا دکھا۔ ان احمقوں کو نیست و نابود کر دے، جلا ڈال، ذبح کر دے ہمارے پاس سے دفع کر اور ان بندۂ شکم راکشسوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے‘‘

(اتھروید، ۳:۴:۱)

’’اے دیوتاؤں کے محبوب، اپنے اچھے مسرت بخش رس کے ساتھ ابل، بدذات پاپیوں کو قتل کرتے ہوئے، دشمنوں کو ان کی نفرت سمیت ہلاک کرتے ہوئے، روز بروز زور پکڑتے ہوئے اور مال غنیمت حاصل کرتے ہوئے ابل‘‘ (سام وید، ۲:۱:۵:۱-۲)

بھاگوت گیتا کا تو مرکزی موضوع ہی جنگ ہے۔ یہ دراصل کرشن جی کے اس طویل اپدیش پر مشتمل ہے جو انہوں نے قدیم ہندوستان میں کوروؤں اور پانڈوؤں کے

درمیان ہونے والی جنگ کے موقع پر پانڈوؤں کے سردار ارجن کو دیا ہے۔ کورو اور پانڈو ایک ہی شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ حکومت واقتدار کی خواہش نے دونوں کو میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کر دیا تھا۔ ارجن نے جب اپنے مدِّ مقابل اپنے بھائیوں اور عزیزوں کو دیکھا تو اس کی ہمت پست ہونے لگی اور جنگ سے اس کی طبیعت بے زار ہونے لگی۔ اس موقع پر کرشن جی نے اسے جنگ پر ابھارنے اور لڑنے کی ترغیب دینے کے لیے یہ اپدیش دیا تھا[1]۔

ان احکام کی مخاطب اسلامی ریاست اور اس کی فوج ہے:

آیاتِ قتال کا مطالعہ اور ان میں غور وتدبر کرتے وقت ایک چیز یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ان کا خطاب اسلامی ریاست اور اس کی فوج سے ہے۔ قرآن نے تمام مسلمانوں کو کھلی چھوٹ نہیں دے دی ہے کہ وہ جب چاہیں اور جہاں پائیں غیر مسلموں کو قتل کر دیں۔ بلکہ اسلامی ریاست سے دشمنی رکھنے والے غیر مسلموں سے جنگ کا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف سربراہِ ریاست کو ہے۔ اسی کو طے کرنا ہے کہ جنگ کی جائے یا نہیں؟ اور کی جائے تو کب اور کیسے؟ رعایا پر ہر حال میں اس کی اطاعت لازم ہے۔ اس پر تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے۔ مشہور فقیہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

> **أمر الجهاد موكول الى الإمام واجتهاده، ويلزم الرعيّة طاعته فيما يراه من ذلك[2]**

> جہاد کا معاملہ سربراہِ ریاست کے ذمّے ہے۔ وہی اس کا فیصلہ کرے گا اور رعایا پر اس کے فیصلہ کو تسلیم کرنا لازم ہے۔

اسی طرح جس قوم سے جنگ ہو رہی ہو اس کے صرف ان افراد کو قتل کرنے کی اجازت دی گئی ہے جو جنگ میں عملاً حصہ لے رہے ہوں یا اس کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ غیر متعلق لوگوں سے تعرّض کرنے اور انہیں نشانہ بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا

---

[1] ہندومت کی مذہبی کتابوں کے یہ حوالے مولانا مودودی کی کتاب الجہاد فی الاسلام کے واسطے سے دیے گئے ہیں۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، طبع سوم ۱۹۸۱ء، ص: ۳۳۳۔۳۵۱

[2] المغنی، ۳۵۲/۸

ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوا فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (البقرة -- ۱۹۰)

اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے مروی ہے کہ ”ولا تعتدوا“ (زیادتی نہ کرو) سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ تم سے عملاً جنگ نہ کر رہے ہوں، مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے اور راہب وغیرہ، انھیں قتل نہ کرو۔ [1]

اس کی تائید بعض احادیث سے ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت انسؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا:

ولا تقتلوا شیخاً فانیاً ولا طفلاً ولا صغیراً ولا امرأةً [2]

اور نہ قتل کرو کسی بوڑھے کھوسٹ کو، کسی بچے کو، کسی کم سن کو اور کسی عورت کو۔

یہی حکم نابینا، معذور، مزدور اور کسان وغیرہ کا ہوگا کہ اگر وہ جنگ میں عملاً شریک نہ ہوں تو ان سے تعرّض نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ جنگ میں شریک ہوں یا اس میں کسی طرح کا تعاون کر رہے ہوں تو ان کے ساتھ بھی دشمن کے برسرِ جنگ افراد جیسا معاملہ کیا جائے گا۔

عام غیر مسلمین کے ساتھ اچھے سلوک کا حکم:

لڑنے، بھرپور وار کرنے، گھات لگانے اور قتل کرنے کے احکام صرف ان غیر مسلمین کے لیے ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ مصروفِ جنگ ہوں۔ رہے عام غیر مسلمین تو ان کے ساتھ انسانی روابط رکھنے، عدل وانصاف کا معاملہ کرنے اور بھلائی اور خیر خواہی کرنے کی کھلی اجازت دی گئی ہے، سورۂ ممتحنہ میں ہے:

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (آیت: ۸)

---

[1] تفسیر طبری، دار المعارف مصر، ۵۶۲/۳-۵۶۳۔ طبری نے بھی اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔

[2] سنن ابو داؤد، کتاب الجہاد، باب فی دعاء المشرکین

> اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غیر مسلموں سے تعلقات کے سلسلے میں یہ ایک بہت اہم آیت ہے۔ اس میں دو الفاظ آئے ہیں۔ "**ان تبرّ وھم**" اور "**تقسطوا الیھم**". "**برّ**" سے مراد ہے حسن سلوک اور صلہ رحمی کرنا[1] اس میں زیادہ سے زیادہ حسنِ سلوک کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے: (**البرّ : التوسّع فی الاحسان الیه**)[2] "**تقسطوا الیھم**" کے معنی بعض مفسرین نے یہ بیان کیے ہیں کہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرو۔ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں اس کے معنی عدل کے نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ خواہ کسی سے جنگ ہو رہی ہو یا نہ ہو رہی ہو، اسلام نے ہر ایک کے ساتھ عدل کرنے کا حکم دیا ہے۔[3]

ابن حیانؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں عدل سے مراد یہ ہے کہ غیر مسلموں سے تعلقات میں میانہ روی اختیار کرو، نہ ان سے بہت زیادہ قربت رکھو اور نہ ان سے بہت دور رہو۔[4]

بعض مفسرین نے '**تقسطوا الیھم**' کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ صلہ رحمی کے طور پر اپنے مال کا کچھ حصہ انھیں دو (**أی تعطو ھم قسطاً من أموالکم علی وجه الصلة**)[5]

اس آیت کے سلسلے میں بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ غیر مسلموں کے سلسلے میں ابتدائی حکم تھا۔ بعد میں یہ حکم ان آیات سے منسوخ ہو گیا جن میں غیر مسلموں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، قرطبیؒ نے قتادہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اس حکم کو منسوخ کرنے

---

[1] تفسیر ابن کثیر، مطبع مصطفیٰ محمد مصر، ۱۳۵۶ھ، ۳۴۹/۴، لسان العرب، ابن منظور، دار صادر بیروت ۱۳۷۴ھ، ۵۴/۴ مادہ "بر"

[2] المفردات فی غریب القرآن، اصفہانی، المطبعة المیمنیہ مصر، ۱۳۲۴ھ، ص: ۹۳

[3] احکام القرآن، ابن العربی، مطبعة السعادة مصر، ۱۳۳۱ھ، ۲۴۹/۲

[4] تفسیر الماوردی، مطابع المقھوی کویت، ۱۴۰۲ھ، ۲۲۳/۴

[5] احکام القرآن، ۲۴۹/۲، تفسیر الماوردی ۲۲۳/۴، تفسیر قرطبی، الھیئة المصریة العامة، ۱۹۸۷ء، ۵۹/۱۸، تفسیر کبیر، رازی، المطبعة العامرة مصر، ۱۳۰۸ھ، ۱۳۴/۸

والی آیت فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبۃ۔ ۵) ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکم صرف صلح (یعنی صلحِ حدیبیہ) کے دوران تھا، جب معاہدہ صلح ختم ہوگیا اور فتحِ مکہ کا واقعہ پیش آ گیا تو یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ لیکن نسخ کے قائلین کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ یہ آیت محکم یعنی غیر منسوخ ہے (وقال أكثر أهل التاويل هي محكمة)[1]

آیت کو محکم سمجھنے والوں میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن سے صلح کا معاہدہ ہوگیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ ان سے مراد غیر مسلموں کی عورتیں اور بچے ہیں کہ وہ عملاً جنگ میں شریک نہیں ہوتے۔ بعض نے اس کی دیگر توجیہات کی ہیں۔ لیکن صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آیت اپنے عموم پر باقی ہے۔ اس میں معاہدین بھی شامل ہیں، محاربین کی عورتیں اور بچے بھی اور ان کے علاوہ وہ غیر مسلم بھی جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف کوئی جارحیت نہ کی ہو۔

امام قرطبیؒ نے لکھا ہے:

> **هذه الآية رخصة من الله تعالىٰ في صلة الذين لم يعادوا المومنين ولم يقاتلوهم**[2]
>
> اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی اجازت دی ہے جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ دشمنی نہیں کی اور ان سے جنگ نہیں کی۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

> **قال أهل التأويل: هذه الآية تدلّ على جواز البرّ بين المشركين والمسلمين، وان كانت الموالاة منقطعة**[3]
>
> مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکوں اور مسلمانوں کے

---

[1] تفسیر قرطبی، ۵۹/۱۸

[2] تفسیر قرطبی، حوالہ سابق

[3] تفسیر کبیر، ۱۳۴/۸

درمیان نیکی اور حسن سلوک کا معاملہ جائز ہے۔ اگر چہ ان کے درمیان موالات (یعنی قریبی تعلق رکھنا) ممنوع ہے۔

ایک مرتبہ قاضی اسماعیل بن اسحاقؒ (م ۲۸۲ھ) کی مجلس میں ایک غیر مسلم آیا۔ انہوں نے اس کے ساتھ عزت و اکرام کا معاملہ کیا۔ حاضرینِ مجلس کو ان کے اس رویے پر ناگواری ہوئی تو انہوں نے ان کے سامنے یہی آیت پیش کی [۱]

مشہور واقعہ ہے کہ فتحِ مکہ سے قبل حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کی والدہ قتیلہ ان سے ملنے آئیں۔ انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ حضرت اسماءؓ نے آں حضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا میں صلہ رحمی کے طور پر انہیں کچھ دے سکتی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں کیوں نہیں، وہ تمہاری ماں ہیں'' [۲]

ابن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ سورۂ ممتحنہ کی آیت **لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ** ......الآیۃ اسی موقع پر نازل ہوئی تھی [۳]

امام طبریؒ نے آیتِ بالا کو غیر منسوخ اور اپنے عموم پر باقی قرار دیتے ہوئے اس پر عہدِ نبوی کے مذکورہ واقعہ سے استدلال کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اس سلسلے میں بہتر اور صحیح قول ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ اس سے مراد تمام ادیان و ملل کے وہ افراد ہیں جو مسلمانوں سے مصروفِ جنگ نہ ہوں۔ آیت میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تمہیں اجازت ہے ''جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہ کی ہو اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہ نکالا ہو'' اس میں کسی کی تخصیص نہیں ہے، بلکہ اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جن میں یہ صفت پائی جاتی ہو۔ ان حضرات کی بات صحیح نہیں ہے جو اس آیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اہل حرب میں سے خواہ کسی سے رشتہ داری یا نسبی تعلق ہو یا نہ ہو، اس کے ساتھ حسنِ سلوک حرام اور ممنوع نہیں ہے۔ بشرطے کہ اس سے اہلِ حرب پر اہلِ اسلام کا

---

[۱] احکام القرآن، ۲/۲۴۹-۲۵۰

[۲] صحیح بخاری، کتاب الھبۃ، باب الھدیۃ للمشرکین، صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب فضل النفقۃ والصدقۃ علی الاقربین والزوج والاولاد والوالدین ولو کانوا مشرکین، مسند احمد ۶/۳۴۴، ۳۴۷، ۳۵۵

[۳] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب صلۃ الوالد المشرک

کوئی راز منکشف نہ ہو اور سامانِ جنگ کے ذریعے انہیں تقویت نہ پہونچے۔ اس بات کی تصدیق حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ سے مروی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں حضرت اسماءؓ اور ان کی ماں کا واقعہ بیان کیا گیا ہے [1]

غیر مسلموں کی ’’دوستی‘‘ سے ممانعت کا مفہوم:

قرآن کریم کی متعدد آیات میں غیر مسلموں سے ’’دوستانہ‘‘ تعلقات رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔

سورۂ آل عمران میں ہے:

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکَافِرِیْنَ اَوْلِیَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ

(آیت: ۲۸)

مومنین اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور یار و مددگار ہرگز نہ بنائیں۔

اس مضمون کی اور بھی آیات ہیں۔ ان کی بنیاد پر بعض حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان خوش گوار سماجی تعلقات کا مخالف ہے۔ وہ مسلمانوں کے دلوں میں غیر مسلموں کے خلاف بغض و نفرت کے ایسے جذبات پروان چڑھاتا ہے کہ ان کے درمیان بقائے باہم کے اصول پر مبنی معاشرت ممکن ہی نہیں۔

مذکورہ آیت اور اس مضمون کی دیگر آیات سے یہ استنباط صحیح نہیں ہے۔ ان آیات میں غیر مسلموں سے ایک خاص طرح کا تعلق رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ ان میں اہلِ ایمان سے کہا گیا ہے کہ وہ کافروں کو ’’أولیاء‘‘ نہ بنائیں۔ اولیاء ’’ولی‘‘ کی جمع ہے۔ اس کا مادّہ ’ول ی‘ ہے۔ ولاء کا مفہوم یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد چیزیں اس طرح یکجا ہوں کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہو جو ان سے مغایر ہو۔ اسی سے استعارۃً یہ لفظ قربت کے معنی میں استعمال ہونے لگا، خواہ یہ قربت جگہ کی ہو، یا تعلق کی، یا مذہب کی، یا دوستی، مدد اور عقیدہ کی۔ جس شخص سے مذکورہ نوعیّتوں میں سے کسی نوعیت کا تعلق ہو اس کے لیے ’’ولی‘‘ اور ’’مولیٰ‘‘ دونوں الفاظ مستعمل ہیں [2]

---

[1] تفسیر طبری، المطبعۃ الکبریٰ مصر، ۱۳۲۹ھ، ۲۸/ ۴۱

[2] المفردات فی غریب القرآن، ص: ۵۵۵

لفظ 'مولیٰ' کا اطلاق عربی زبان میں بہت سے لوگوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً: رب، مالک، آقا، محسن، غلام آزاد کرنے والا، مددگار، محبت کرنے والا، تابع داری کرنے والا، پڑوسی، چچازاد بھائی، حلیف، جس سے عہد و پیمان ہو، قرابت دار (داماد)، غلام، آزاد کردہ غلام، جس پر احسان کیا جائے۔ علامہ ابن الاثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس لفظ کا استعمال حدیث میں ان میں سے بیش تر معانی میں ہوا ہے۔ ہر جگہ سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس معنی میں آیا ہے۔[۱]

مذکورہ آیت میں یہ لفظ ''انتہائی قربت'' کے معنی میں آیا ہے۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

أولیاء: أی خاصتکم وبطانتکم منھم[۲]

کافروں کو اپنا اولیاء یعنی بہت قریبی اور راز دار نہ بناؤ۔

زمخشریؒ اس کا مفہوم یہ بتاتے ہیں:

لاتتخذوھم أولیاء تنصرونھم وتستنصرونھم وتؤاخونھم و تصافونھم وتعاشرونھم معاشرۃ المومینن[۳]

کافروں کو اولیاء نہ بناؤ، یعنی ان سے تمہارا معاملہ ایسا نہ ہو کہ تم ان کی مدد کرو، ان سے مدد چاہو، ان سے بھائی چارہ اور خلوص و محبت کے تعلقات رکھو اور ان کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہو جس طرح اہل ایمان باہم رہتے ہیں۔

جن حالات میں مسلمانوں کو کافروں سے انتہائی قربت کا تعلق رکھنے سے منع کیا گیا تھا انہیں بھی نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ مسلمان سخت حالات سے گزر رہے تھے۔ ان کے خلاف کافروں نے جنگ برپا کر رکھی تھی اور انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے تھے۔ یہود و نصاریٰ کا رویّہ بھی کھلی دشمنی پر مبنی تھا۔ وہ مسلمانوں کے خلاف کافروں کا ساتھ دے رہے تھے۔ ایک تیسرا گروہ منافقین کا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ظاہر میں اسلام کا دم بھرتے تھے اور انہوں نے خود کو مسلمانوں میں شامل کر رکھا تھا، لیکن حقیقت میں وہ کافروں

---

[۱] النہایۃ فی غریب الحدیث، ابن اثیر، المطبعۃ العثمانیۃ مصر، ۱۳۱۱ھ، ۲۳۱/۴، لسان العرب، ۴۰۹/۱۵

[۲] تفسیر قرطبی، ۴۲۵/۵

[۳] کشاف، زمخشری، مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی مصر، ۱۹۷۳ء، ۶۱۹/۱

کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کو کوئی کامیابی ملتی تو ان کے سینوں پر سانپ لوٹتے تھے اور انہیں کچھ نقصان پہنچتا تو خوشیاں مناتے تھے۔ یہ سارے لوگ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی پر متّحد تھے۔ ایسے حالات میں اپنے دشمنوں سے قریبی تعلق رکھنا ان کے لیے انتہائی خطرناک تھا۔ یہ چیز دینی حیثیت سے بھی ضرر رساں تھی اور سیاسی اعتبار سے بھی۔ اسی لیے قرآن نے الگ الگ ہر گروہ کے بارے میں وضاحت سے مسلمانوں کو تاکید کی کہ ان سے ''ولایت'' کا تعلق نہ رکھیں۔ کفار کے بارے میں کہا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لَاتَتَّخِذُوا الْکَافِرِیْنَ اَوْلِیَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (النساء - ۱۴۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔

یہود و نصاریٰ سے تعلقات کے سلسلے میں بھی یہی حکم دیا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لَاتَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰیٓ اَوْلِیَاءَ، بَعْضُھُم اَوْلِیَاءُ بَعْضٍ، وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ فَاِنَّهٗ مِنْھُمْ (المائدۃ - ۵۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے۔

منافقین کے بارے میں فرمایا:

وَدُّوا لَوْ تَکْفُرُوْنَ کَمَا کَفَرُوْا فَتَکُوْنُوْنَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْھُمْ اَوْلِیَاءَ (النساء - ۸۹)

وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اسی طرح تم بھی کافر ہو جاؤ، تاکہ تم اور وہ سب یکساں ہو جائیں، لہٰذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔

اس معاملہ میں قرآن نے اس حد تک تاکید کی کہ جن لوگوں کے باپ اور بھائی دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے ہیں اور انہوں نے ایمان پر کفر کو ترجیح دی ہے، ان سے بھی قربت کا ویسا تعلق نہ رکھا جائے جیسا کہ اہل ایمان کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ مبادا ان کے واسطے سے ان کے اسرار کفار تک نہ پہنچ جائیں۔

يٰـاَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَنُـوا لاتَتَّـخِـذُوا اٰبَـآءَ كُـمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيـآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ، وَمَن يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (التوبة –۲۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔

قرآن کی بعض آیات میں ان اسباب کی بھی وضاحت کردی گئی ہے جن کی بنا پر مسلمانوں کے علاوہ دوسروں سے انتہائی قربت کا تعلق رکھنے سے منع کیا گیا ہے:

يٰـاَيُّهَـا الَّذِيْنَ آمَنُوا لاتَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِباً مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَاءَ (المائدة–۵۷)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے پیش رو اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنالیا ہے، انہیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ۔

سورۂ ممتحنہ میں ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لاتَتَّخِذُوا عَدُوِّى وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَاءَ (آیت : ۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناو۔

اسی سورت میں آگے ہے:

اِنَّـمَـا يَـنْهٰـكُـمُ الـلّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوكُمْ فِى الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَـارِكُـمْ وَظٰهَـرُوا عَـلٰىٓ اِخْـرَاجِـكُـمْ اَنْ تَـوَلَّوهُـمْ ، وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (آیت ـ۹)

وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔

پہلی آیت میں بتایا گیا کہ ان لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل

بنا رکھا ہے۔ اس کو وہ سنجیدگی سے نہیں لے رہے ہیں۔ دوسری آیت میں کہا گیا کہ وہ تمہارے دشمن ہیں اور تیسری آیت میں یہ وضاحت کی گئی کہ وہ محض دین کی وجہ سے تم سے جنگ کرر ہے ہیں، تمہیں تمہارے وطن سے نکالا ہے یا اس میں مدد کی ہے۔ یہ اسباب بجا طور پر اس بات کے متقاضی تھے کہ ان سے قریبی تعلق نہ رکھا جائے۔

یہی مضمون ایک دوسری آیت میں یوں آیا ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لاتَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَايَألُوْنَكُمْ خَبَالاً، وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ، قَدْبَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ (آل عمران - ۱۱۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔ وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے۔ تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔

اس آیت میں لفظ "بطانة" کے استعمال میں بڑی بلاغت پائی جاتی ہے۔ بطانة کپڑے کے اندرونی حصہ کو کہتے ہیں جو جسم سے متصل ہوتا ہے۔ بطور استعارہ اس کا اطلاق اس شخص پر کیا جاتا ہے جسے آدمی اپنا گہرا دوست اور ہم دم وہم راز بنالے"[1]

اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے علاوہ دوسروں سے اتنا قریبی تعلق استوار نہ کرلو کہ ان پر اپنے راز منکشف کردو۔ اس لیے کہ وہ لوگ تمہارے بہی خواہ نہیں ہیں۔ تمہیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور تم سے دشمنی اور نفرت ان کے رویّے سے عیاں ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ غیر مسلموں سے ہر طرح کے تعلق سے منع نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ممانعت صرف "ولایت" یعنی مخصوص قسم کے قریبی تعلق کی ہے۔ جہاں تک عام انسانی اور سماجی تعلقات رکھنے کی بات ہے وہ اس ممانعت میں داخل نہیں ہے۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں:

---

[1] تفسیر طبری، ۱۳۸/۷، کشاف، ۴۵۸/۱، تفسیر قرطبی، ۱۷۸/۴

الإحسان والهبة مستثناة من الولاية [1]

غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک اور انہیں کچھ دینا ''ولایت'' میں شامل نہیں ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

''مومن کے کافر کو ''ولی'' بنانے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱- وہ اس کے کفر کو پسند کرتا ہو، اور اس کے باوجود اس سے دوستانہ تعلقات رکھتا ہو۔

۲- اس کو برسرِ باطل سمجھنے کے باوجود رشتہ داری یا قلبی تعلق کے سبب اس کی طرف مائل ہو، اس کا تعاون، حمایت اور نصرت کرتا ہو۔

۳- دنیاوی معاملات میں اچھے تعلقات کا اظہار کرے۔

اول الذکر دو صورتیں ممنوع ہیں، تیسری صورت ممنوع نہیں ہے۔'' [2]

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سماجی سطح پر پائی جانے والی خلیج کا ذمہ دار قرآن کو قرار دینا سراسر اتہام، اس کی تعلیمات کا ناقص مطالعہ اور حقیقت سے بعید تر بات ہے۔

☆ ☆ ☆

---

[1] تفسیر قرطبی، ۹۴/۸

[2] تفسیر کبیر، ۴۵۰/۲

(حضرت سودہؓ) سے نکاح کیا وہ آپ کی ہم سن اور بیوہ تھیں۔

(۵) بقیہ نو ازواجِ مطہرات سے آپؐ کا نکاح ترپن سال کی عمر سے ساٹھ سال کی عمر کے درمیانی عرصہ میں ہوا۔ یہ ساری خواتین (سوائے ایک حضرت عائشہؓ کے) ایک، دو یا تین شوہروں کی بیویاں رہ چکی تھیں۔

(۶) اپنی عمر کے آخری تین سالوں میں، جب کہ جزیرۃ العرب کے بڑے حصے پر آپ کا اقتدار قائم ہو چکا تھا، آپ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔

درج بالا تفصیلات معترضین کے اس اعتراض کی جڑ کاٹ دیتی ہیں کہ آں حضرت ﷺ کی کثرتِ ازواج کا سبب خواہشِ نفسانی کا غلبہ تھا۔ کیا یہ الزام اس شخص پر لگایا جا سکتا ہے جس نے اپنی جوانی کے ایام صرف ایک خاتون کی رفاقت میں گزارے ہوں اور وہ بھی ایسی جو عمر میں اس سے پندرہ سال بڑی ہو اور اس سے پہلے دو شوہروں کی بیوی رہ چکی ہو؟!

اس مسئلہ پر دو اور پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک یہ کہ اگر آپؐ پر خواہشِ نفسانی کا غلبہ تھا تو اس کی تکمیل کا بہترین موقع وہ تھا جب دعویٔ نبوت کے پانچویں چھٹے سال آپ کے مخالفین آپ کی دعوت کو روکنے میں پورا زور لگا رہے تھے اور آپ کے سامنے پیش کش کر رہے تھے کہ اگر تمہاری اس دعوت کا کوئی دنیاوی مقصد ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں، تمہارے قدموں میں مال و دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں اور عرب کی حسین ترین عورت سے تمہارا نکاح کیے دیتے ہیں، لیکن آپؐ نے ان کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔[۱] اس وقت آپ کے نکاح میں پچپن سال کی ایک بوڑھی خاتون (حضرت خدیجہؓ) تھیں۔

دوسرے یہ کہ حضور کے زمانے میں آپؐ کے مخالفین نے آپؐ پر طرح طرح کے الزامات لگائے، شاعر کہا، مجنون اور سحر زدہ کہا، خواہشِ اقتدار کا طعنہ دیا اور دوسرے الزامات عائد کیے، مگر آپ کے کٹر سے کٹر دشمن کو بھی آپ پر نفسانی ہوس کا الزام لگانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اگر انہوں نے آپ کی ذات میں اس کا ادنیٰ سا بھی شائبہ محسوس کیا ہوتا

---

[۱] جامع البیان فی تفسیر القرآن۔ ابن جریر طبری، المطبعۃ المیمنیہ مصر جزء ۳۰، ص: ۱۸۷ (عن ابن عباس)

تو آپ کے خلاف پروپیگنڈا کا ان کے ہاتھ اس سے بہتر حربہ اور کوئی نہ آ سکتا تھا۔

کثرتِ ازواج معیوب نہیں تھی:

قدیم زمانے میں کثرتِ ازواج معیوب نہیں تھی۔ مختلف پیغمبروں کی ایک سے زیادہ ازواج ہونا ثابت ہے۔ اسی طرح مختلف قوموں کے برگزیدہ اور سر برآوردہ لوگ ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے مثلاً:

حضرت ابراہیمؑ کی تین بیویاں تھیں: سارہ، ہاجرہ اور قتورہ (پیدائش ۱۶:۲۴، ۱۸:۱۵، ۲۵:۱)

حضرت یعقوبؑ کی چار بیویاں تھیں: لیاہ، زلفہ، زاخل اور بلہاہ (پیدائش ۲۹:۲۳، ۲۴، ۲۸، ۲۹)

حضرت موسیٰؑ کی چار بیویاں تھیں: صفورہ، حبشیہ، قینی اور بنت حباب (خروج:۲، ۲۱ قاضیوں ۱:۱۶، ۴:۱۶)

حضرت داؤدؑ کی نو بیویوں کا نام ملتا ہے۔ (سموئیل اول ۱۸:۲۷، سموئیل دوم ۳:۲-۵، ۵:۱۳، ۱۱:۲۶)

حضرت سلیمانؑ کی سات سو بیویوں اور تین سو حرموں کا تذکرہ ملتا ہے (سلاطین اول ۱۱:۳)

راجہ دسرتھ کی تین بیویاں تھیں: پٹ رانی کوشلیہ، رانی سمترا اور رانی کیکئی۔

کرشن جی کی لاتعداد گوپیوں کے علاوہ ان کی رانیوں کی تعداد اٹھارہ تھی۔

راجہ پانڈو کی دو بیویاں تھیں۔ [1]

عہدِ جاہلیت میں بھی بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ لوگ جتنی عورتوں سے چاہتے نکاح کر لیتے تھے۔ قبیلۂ ثقیف کے ایک رئیس غیلان بن سلمہ نے اسلام قبول کیا۔ اس وقت اس کے نکاح میں دس عورتیں تھیں [2]۔ حارث بن قیس بن عمیرۃ الاسدی کے

---

[1] رحمۃ للعالمین، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۲/۱۴۸-۱۵۲

[2] جامع ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی الرجل یسلم وعندہ عشر نسوۃ، سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب الرجل یسلم وعندہ اکثر من اربع نسوۃ۔

نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں [1]۔ نوفل بن معاویہ الدیلی کے یہاں پانچ عورتیں تھیں [2]۔ مورخ ابنِ حبیب نے قبیلۂ ثقیف کے ایسے متعدّد افراد کا تذکرہ کیا ہے جن کے نکاح میں بعثتِ نبوی کے وقت دس دس عورتیں تھیں [3]۔

قرآن نے چار کی حد مقرر کی:

قرآن نے مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی اور اس کو بھی عدل کی شرط سے مشروط کیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

> فَانْكِحُوا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ، فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (النساء:۳)
>
> تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرلو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو۔

چناں چہ جن لوگوں کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں، اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ ان میں سے جن کو چاہیں بیوی کی حیثیت سے باقی رکھیں، بقیہ کو طلاق دے دیں۔ [4]

نبیؐ کو اس حکم سے مستثنیٰ رکھا گیا:

آیتِ بالا کے نزول کے وقت آں حضرت ﷺ کے گھر میں بھی چار ازواجِ مطہّرات (حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ) تھیں۔ (حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینب بنتِ خزیمہؓ کا انتقال ہوچکا تھا) لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس حکم سے مستثنیٰ رکھا اور آپ کو چار سے زیادہ خواتین سے نکاح کرنے کی اجازت دی۔

---

[1] سنن ابوداؤد، کتاب النکاح، باب من اسلم وعندہ نساء اکثر من اربع، سنن ابن ماجہ، حوالۂ سابق

[2] تفسیر کبیر، رازی، المطبعۃ العامرۃ مصر، ۲/۱۴۲، تفسیر ابن کثیر، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر، ۱/۴۵۱ بحوالہ مسند امام شافعی

[3] المحبّر، محمد بن حبیب بغدادی، دائرۃ المعارف العثمانیۃ حیدرآباد، ۱۹۴۲ء، ص: ۱۵۷

[4] جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، المحبّر، حوالہ سابق

چناں چہ آپ نے جب پانچویں خاتون (حضرت زینب بنتِ جحشؓ) سے نکاح کیا اس وقت قدرتی طور پر بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال اٹھا ہوگا کہ آں حضرت ﷺ جب دوسروں کے لیے بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ناجائز قرار دیتے ہیں تو خود یہ پانچواں نکاح کیسے کرلیا۔ ممکن ہے بعض مخالفوں نے اس کو بنیاد بنا کر فتنہ پھیلانے کی کوشش کی ہو۔

اس موقع پر قرآن نے صراحت کی کہ تعدّدِ ازواج کی اس تحدید سے آپ مستثنیٰ ہیں:

يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الّٰتِيْ اٰتَيْتَ أُجُوْرَهُنَّ
وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ أَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ
عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ
وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ
يَّسْتَنْكِحَهَا ۚ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۗ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا
عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (الأحزاب: ٥٠)

اے نبی ہم نے تمہارے لیے حلال کردیں تمہاری وہ بیویاں جن کے مہر تم نے ادا کیے ہیں اور وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمہاری ملکیت میں آئیں اور تمہاری وہ چچازاد اور پھوپھی زاد اور ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنہوں نے تمہارے ساتھ ہجرت کی ہے اور وہ مومن عورت جس نے اپنے آپ کو نبی کے لیے ہبہ کیا ہو اگر نبی اسے نکاح میں لینا چاہے۔ یہ رعایت خاص تمہارے لیے ہے، دوسرے مومنوں کے لیے نہیں ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں کیا حدود عائد کیے ہیں۔ (تمہیں ان حدود سے ہم نے اس لیے مستثنیٰ کیا ہے) تا کہ تمہارے اوپر کوئی تنگی نہ رہے اور اللہ غفور و رحیم ہے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ تعدّدِ ازواج کے سلسلے میں عام قاعدے سے صرف رسول کریم ﷺ کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ (خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ) ساتھ ہی اس کی حکمت بھی بیان کردی گئی ہے اور وہ یہ کہ ''آپ کے اوپر کوئی تنگی نہ رہے''

(لِـكَيْلَا يَـكُـوْنَ عَـلَـيْـكَ حَـرَجٌ) "تنگی" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نعوذ باللہ آپ کی خواہشاتِ نفس بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھیں، ان کی تکمیل کے لیے آپ کو چار کی قید سے آزاد رکھا گیا اور اجازت دی گئی کہ جتنی عورتوں سے چاہیں نکاح کر لیں، تاکہ چار بیویوں تک محدود رہنے میں آپ تنگی محسوس نہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر دینِ حق کی تبلیغ و اشاعت کی جو عظیم ذمہ داری عائد کی تھی اور جس ماحول میں آپ اسے انجام دے رہے تھے یہ دونوں چیزیں جس شخص کی نظر میں ہوں وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ عام قاعدے سے آپ کو مستثنیٰ رکھنا کیوں ضروری تھا؟ اور چار کی قید میں آپ کے لیے کیا "تنگی" تھی؟

کثرتِ ازواج کے مصالح:

ان تفصیلات سے اس اعتراض کی جڑ کٹ جاتی ہے کہ آں حضرت ﷺ کی کثرتِ ازواج کا سبب آپؐ کی بڑھی ہوئی نفسانی خواہش تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس کے کیا مصالح تھے؟

آں حضرت ﷺ کے نکاحوں میں غور کرنے سے درج ذیل مصالح سامنے آتے ہیں:

الف: اصحاب کی دل جوئی:

دین کی تبلیغ و اشاعت کی راہ میں بعض صحابہ اور صحابیات نے غیر معمولی قربانیاں دی تھیں اور ان کی نصرت اور تعاون سے آپ کو بہت سہارا ملا تھا۔ آپؐ نے ان کی دل جوئی کرنے، ان کی رفاقت کو پختہ تر کرنے اور ان کی قدر افزائی کے لیے بعض نکاح کیے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ آپ کے قریب ترین اصحاب تھے۔ آپؐ نے ان کی دل جوئی اور قدر دانی کے لیے ان کی صاحب زادیوں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ سے نکاح کیا۔ حضرت سودہؓ ابتدائی عہد میں اسلام قبول کرنے اور حبشہ ہجرت کرنے والوں میں سے تھیں۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے سخت آزمائشیں جھیلی تھیں۔ ان کی سبقتِ اسلام، ہجرتِ حبشہ اور قربانیوں کا لحاظ کرتے ہوئے حضور نے ان سے نکاح کیا۔ اس وقت ان کی عمر پچاس سال تھی اور حضور کی عمر بھی اتنی ہی تھی۔ ہر ذی عقل سمجھ سکتا ہے کہ ایک پچاس

سالہ بیوہ سے نکاح میں جنسی محرک کیا ہو سکتا ہے؟ حضرت زینب بنت خزیمہؓ کے تیسرے شوہر عبداللہ بن جحشؓ آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ وہ غزوۂ احد میں شہید ہو گئے تو آپؐ نے قرابت کا لحاظ کرتے ہوئے اور غزوۂ احد میں بڑی تعداد میں صحابہ کے شہید ہو جانے سے پیدا ہونے والی سماجی پیچیدگی کو دور کرنے کے لیے حضرت زینبؓ سے نکاح کیا۔ حضرت ام سلمہؓ کے پہلے شوہر حضرت ابو سلمہؓ حضورؐ کے رضاعی بھائی اور السابقون الاولون میں سے تھے۔ انہوں نے حبشہ ہجرت کی تھی، پھر وہاں سے واپس آ کر ہجرت مدینہ کا شرف بھی حاصل کیا تھا اور اس میں اپنی بیوی اور بچے سے طویل عرصہ تک جدائی بھی برداشت کی تھی۔ انہوں نے غزوۂ احد میں زخمی ہونے کے بعد وفات پائی۔ اس وقت ان کے چار بچے تھے۔ حضورؐ نے زوجین کی بے مثال قربانیوں کی قدر افزائی اور بچوں کی کفالت کے مقصد سے حضرت ام سلمہؓ سے نکاح کیا۔ اسی طرح حضرت زینب بنتِ جحشؓ سے آپؐ نے ان کی دل شکنی اور ذہنی اذیت کی تلافی کے لیے نکاح کیا تھا (نکاحِ زینب کے دیگر مصالح پر بحث آگے آئے گی)

ب: دین کی توسیع اور استحکام:

جب آں حضرت ﷺ کی بعثت ہوئی اس زمانے میں عرب میں قبائلی نظام بڑا مستحکم تھا۔ اپنے کسی فرد کی حمایت میں عموماً پورا قبیلہ متحد ہو جاتا تھا۔ کفار نے جب آپؐ کا معاشی بائیکاٹ کیا تو پورے بنو ہاشم نے آپ کا ساتھ دیا تھا۔ آں حضرت ﷺ کی تمام ازواج الگ الگ قبیلوں سے تعلق رکھتی تھیں:

(١) حضرت خدیجہؓ	بنو عُزیٰ
(٢) حضرت سودہؓ	بنو عامر
(٣) حضرت عائشہؓ	بنو تیم
(٤) حضرت حفصہؓ	بنو عدی
(٥) حضرت زینب بنتِ خزیمہؓ	بنو ہلال

(۶) حضرت ام سلمہ ؓ	بنو مخزوم
(۷) حضرت زینب بنت جحش ؓ	بنو اسد
(۸) حضرت جویریہ ؓ	بنو مصطلق
(۹) حضرت صفیہ ؓ	بنو ہارون
(۱۰) حضرت ام حبیبہ ؓ	بنو امیّہ
(۱۱) حضرت میمونہ ؓ	بنو عیلان

مختلف قبائل میں آں حضرت ﷺ کے نکاح کرنے سے ایک فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ان قبائل سے قربت پیدا ہوئی، انہوں نے سنجیدگی سے اسلام کے بارے میں غور کیا اور اسے قبول کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ اس طرح مختصر مدت میں دین کی توسیع اور استحکام کی راہ ہموار ہوئی۔

ج۔ عداوتوں کا خاتمہ:

ان نکاحوں سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ جن قبائل اور خاندانوں سے آپ ؐ کے سسرالی رشتے قائم ہوئے انہوں نے اپنی عداوتیں ختم کر دیں اور آپ ؐ کے خلاف ان کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔

حضرت ام حبیبہ ؓ ابو سفیان ؓ کی بیٹی تھیں، جنہوں نے آں حضرت ﷺ کے خلاف ہر موقع پر لشکر کی قیادت کی تھی۔ لیکن ان سے آپ ؐ کے نکاح کے بعد ان کے باپ کی مخالفت کم زور پڑ گئی اور وہ پھر کبھی آپ ؐ کے مقابلے پر نہیں آئے، یہاں تک کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ اور ان کے دونوں فرزند حضرت معاویہ ؓ اور حضرت یزید ؓ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ حضرت جویریہ ؓ قبیلۂ بنو مصطلق کے سردار حارث کی بیٹی تھیں۔ ان سے نکاح کے بعد ان کا پورا قبیلہ رہزنی سے تائب ہو کر مسلمان ہو گیا۔ حضرت صفیہ ؓ کا تعلق یہود کے اس قبیلے سے تھا جس کا سلسلۂ نسب حضرت ہارون علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ ان کے امہات المومنین میں شامل ہونے سے یہود کی سازشوں کو کم کرنے میں مدد ملی۔

د۔ عورتوں کی تعلیم وتربیت:

آں حضرت ﷺ جس عظیم مقصد کو لے کر مبعوث ہوئے تھے اس کے لیے صرف مردوں کی تعلیم وتربیت کافی نہیں تھی، بلکہ عورتوں کی تعلیم وتربیت بھی اتنی ہی ضروری تھی۔ لیکن چوں کہ اسلامی معاشرت میں مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط ممنوع تھا اس لیے عورتوں کی براہ راست تعلیم وتربیت کے لیے زیادہ وقت فارغ کرنا آپؐ کے لیے ممکن نہ تھا۔ دوسرے، بہت سے نسوانی مسائل ایسے ہیں جن کو علی الاعلان یا عورتوں کے سامنے کھول کر بیان کرنے میں حیا مانع ہوتی ہے اور اللہ کے رسول ﷺ تو جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے کہ کنواری پردہ نشین سے زیادہ حیادار تھے[1]۔ اس بنا پر عورتوں کی تعلیم وتربیت کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا تھا کہ آپ مختلف خواتین سے نکاح کر کے ان کی براہ راست تعلیم وتربیت کریں اور انہیں دوسری عورتوں کو دین سکھانے کے لیے تیار کریں۔ نسوانی مسائل کی بہت سی گتھیوں کو سلجھانے میں ازواجِ مطہرات کا غیر معمولی کردار ہے۔ انہوں نے وہ مسائل خود آں حضرت ﷺ سے دریافت کر کے دوسری صحابیات کو بتائے، یا صحابیات ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کرتی تھیں تو وہ حضور ﷺ سے رجوع کر کے انہیں جواب دیتی تھیں۔

مخصوص مسائل سے ہٹ کر بھی بہت سی تعلیمات اور احکام کا علم امت کو ازواجِ مطہرات ہی کے واسطے سے ہوا ہے۔ وہ خلوت گاہِ نبوت کی راز دار تھیں۔ انہیں بہت سی ان باتوں کی خبر رہتی تھی جو دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھیں۔ دین کی بہت سی تعلیمات انہوں نے خود رسول اللہ ﷺ سے دریافت کر کے حاصل کیں اور آپؐ بھی انہیں مستفید فرماتے رہتے تھے۔ آں حضرت ﷺ کے ارشاداتِ عالیہ کی معتد بہ تعداد ایسی ہے جو ہم تک صرف ازواجِ مطہرات کے ذریعے سے پہنچی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب صفت النبی ﷺ، صحیح مسلم کتاب الفضائل

ھ۔ حسنِ معاشرت کا اعلیٰ نمونہ:

آں حضرت ﷺ نے اپنی ازدواجی زندگی کے ذریعے حسنِ معاشرت کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ آپ کی ازواج مختلف قبائل سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی عمریں بھی متفاوت تھیں اور ان کے مزاجوں میں بھی فرق تھا۔ ان میں ایک کنواری تھی اور ایک مطلقہ۔ ان میں ایک ایک شوہر کی بیوائیں بھی تھی، دودو شوہروں کی بیوائیں بھی اور تین شوہروں کی بیوہ بھی۔ لیکن ان کے درمیان پوری زندگی میں باہمی تلخی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان کے تعلقات آپس میں بھی ہمیشہ خوش گوار رہے اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ آں حضرت ﷺ کے تعلقات بھی مثالی رہے۔ آپؐ کی حیات طیبہ اس شخص کے لیے بھی زندہ نمونہ ہے جس کا نکاح اپنے سے بڑی اور پختہ عمر کی عورت کے ساتھ ہوا ہو کہ اس کے ساتھ کیسی خوش گوار ازدواجی زندگی گزاری جاسکتی ہے اور اس شخص کے لیے بھی جس کی بیوی نوعمر ہو کہ کس طرح اس کی دل داری کی جاتی ہے۔ آپ کی زندگی ہر شخص کے لیے اسوہ ہے، خواہ اس کا نکاح کنواری سے ہوا ہو یا مطلّقہ سے، کسی صاحبِ اولاد بیوہ سے ہوا ہو یا بے اولاد بیوہ سے۔ آپؐ کی کثرتِ ازواج کی ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اس طرح مختلف پہلوؤں سے آپ کا اسوہ نمایاں ہو اور ہر شخص اپنے حالات کے لحاظ سے اس سے رہنمائی حاصل کر سکے۔

حضورؐ پر عائد بعض پابندیاں:

آں حضرت ﷺ کو اگرچہ بیویوں کے سلسلے میں چار کی قید سے آزاد رکھا گیا تھا، لیکن آپ پر بعض پابندیاں عائد کردی گئی تھیں۔ یہ پابندیاں ایسی تھیں جن سے آپؐ کی امت آزاد تھی۔ مثلاً:

۱۔ ہر مسلمان کے لیے چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹیوں سے بلا کسی قید کے نکاح جائز ہے، لیکن آں حضرت ﷺ کے لیے ان میں سے صرف انہی سے نکاح جائز قرار دیا گیا جنہوں نے مدینہ ہجرت کی ہو۔ ارشاد ہے:

وَبَنٰتِ عَمِّکَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِکَ وَبَنٰتِ خَالِکَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِکَ
الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَکَ (الأحزاب : ۵۰)

اور (اے نبی ہم نے تمہارے لیے حلال کر دیں) تمہاری وہ چچا زاد اور پھوپھی زاد اور ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنہوں نے تمہارے ساتھ ہجرت کی ہے۔

چناں چہ بعض روایات میں ہے کہ آں حضرت ﷺ اپنے محبوب چچا جناب ابو طالب کی بیٹی امّ ہانیؓ سے نکاح کے خواہش مند تھے، مگر یہ اس لیے ممکن نہ ہو سکا کیوں کہ انہوں نے مدینہ ہجرت نہیں کی تھی اور وہ ''طلقاء'' (فتح مکہ کے موقع پر ایمان لانے والوں) میں سے تھیں۔[1]

۲۔ سورۂ احزاب کی آیت ۵۰ میں عورتوں کی چند اصناف (جن سے حضورؐ کا نکاح حلال تھا) کا تذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا:

لَایَحِلُّ لَکَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ (الأحزاب – ۵۲)

ان کے علاوہ دوسری عورتیں تمہارے لیے حلال نہیں ہیں۔

یعنی مذکورہ اصناف کی خواتین کے علاوہ دوسری تمام عورتیں آں حضرت ﷺ کے لیے حرام کر دی گئی تھیں۔

۳۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھ سکتا ہے، لیکن وہ قانوناً ان سب کو یا ان میں سے بعض کو طلاق دے کر ان کی جگہ دوسری عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے، لیکن آں حضرت ﷺ کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ اپنی ازواجِ مطہرات میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری بیوی لے آئیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَکَ حُسْنُهُنَّ (الأحزاب: ۵۲)

اور نہ اس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی پسند ہو۔

آں حضرت ﷺ پر عائد ان پابندیوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر چہ

---

[1] جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ احزاب، تفسیر ابن کثیر ۳/۴۹۹

ازواج کے معاملے میں آپ کو چار کی قید سے آزاد رکھا گیا تھا، لیکن آپ پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں وہ ایسی تھیں کہ نکاح اور طلاق دونوں معاملات میں آپ مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پابند تھے۔

خلاصۂ کلام:

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ سیرتِ نبوی کے دیگر پہلوؤں کی طرح اس کا ازدواجی پہلو بھی تاب ناک اور مثالی ہے۔ ازواج مطہرات کی کثرتِ تعداد کو دیکھ کر ذاتِ نبوی پر نفسانیت کا الزام لگانا سراسر تعصب اور جہالت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ دین کے استحکام میں مدد لی گئی اور اس کی تعلیم و تبلیغ کے لیے انہیں واسطہ بنایا گیا۔ رضی اللہ عنھنّ ورضین عنہ

☆ ☆ ☆

ازواجِ مطہّرات کو دوسرے نکاح کا حق کیوں نہیں دیا گیا؟

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آں حضرت ﷺ کی وفات کے بعد ازواجِ مطہرات کو دوسرا نکاح کرنے کا حق کیوں نہیں دیا گیا؟ اسلام میں غیر شادی شدہ (کنواری) مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے نکاح پر زور دیا گیا ہے، پھر حضورؐ کی بیواؤں سے یہ حق کیوں سلب کرلیا گیا؟

یہ اعتراض دین کی حقیقت اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اہلِ بیت کی حیثیت اور مقام و مرتبہ سے ناواقفیت کے نتیجے میں کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی تھوڑی سی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

رسول ﷺ اور آپؐ کے اہلِ بیت کی حیثیت:

رسول اللہ ﷺ امّت کو راہِ حق دکھانے کے لیے تشریف لائے تھے۔ آپ ان کے سب سے بڑے خیر خواہ تھے اور ان کے لیے ماں باپ سے بڑھ کر شفیق و رحیم تھے۔ اس لیے آپ کا حق بھی مسلمانوں پر دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ ہے۔ ان کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ آپؐ کو اپنے ماں باپ، اولاد، رشتہ داروں اور تمام انسانوں سے زیادہ عزیز رکھیں اور ان کے دلوں میں آپ کی محبت دنیا کی ہر شئے سے بڑھ کر ہو۔ اسی مضمون کو ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے:

لا یُومن اَحدُ کم حتّٰی اکونَ احبَّ الیه من والده وولده والناس أجمعین [۱]

---

[۱] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول ﷺ من الایمان

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے ماں باپ، اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

ان پر لازم ہے کہ آپ کے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کردیں اور آپ کے کسی حکم اور فیصلہ کے سامنے ان کے لیے کسی چوں وچرا کی گنجائش نہ ہو۔ ارشادِ باری ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الأحزاب - ۳۶)

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کردے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔

رسول اللہ ﷺ سے اس غایت درجہ محبت اور انتہائی عظمت کا فطری تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں آپؐ کی ازواجِ مطہرات کے لیے بھی ویسے ہی جذبات ہوں۔ آں حضرت ﷺ سے نسبت کی بنا پر ان کے لیے ویسا ہی احترام، عظمت اور عقیدت ہو جیسا شریف بیٹوں کا اپنی ماؤں کے لیے ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی بدرجہا زیادہ ہونا چاہیے۔ اس حقیقت کو قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے:

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ (الأحزاب: ۶)

بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔

ازواجِ مطہرات کے سلسلے میں اس درجہ احترام اور عقیدت ہوتے ہوئے کوئی مسلمان ان سے نکاح کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اس تصور کو وہ اپنی ماں سے نکاح کے تصور سے زیادہ شرم انگیز محسوس کرے گا۔ اسی فطری تقاضے کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن میں نبی ﷺ کے بعد آپ کی ازواج سے نکاح کی حرمت کی صراحت کردی گئی ہے:

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا (الأحزاب : ۵۳)

تمہارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسول کو تکلیف دو اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو۔

ازواجِ نبی امّت کی معلّمات ہیں:

اس پر ایک دوسرے پہلو سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ازواجِ مطہرات پر دین کے معاملے میں دوہری ذمہ داری عائد تھی۔ ایک طرف تو ان پر لازم تھا کہ وہ دنیا کی چندروزہ زندگی پر فریفتہ ہونے کے بجائے آخرت کی ابدی زندگی کو ترجیح دیں، اللہ اور اس کے رسول کی رضا کی طالب ہوں، ان کی اطاعت کریں اور نیک عمل کریں۔ دوسری طرح ان پر یہ ذمہ داری بھی عائد کی گئی تھی کہ ان کے گھروں میں اللہ کی جو آیات سنائی جاتی ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ حکمت کی جو باتیں ارشاد فرماتے ہیں انھیں دوسروں تک پہنچائیں، آپ کی اندرونِ خانہ زندگی کا ایک ایک پہلو محفوظ رکھیں اور اس سے دوسروں کو باخبر کریں۔ سورۂ احزاب میں ازواجِ مطہرات کی ان دونوں ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسری ذمہ داری کے تعلق سے فرمایا گیا ہے:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (الأحزاب: ۳۴)

اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا چرچا کرو۔

ازواجِ مطہرات نے اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی نبھایا۔ انہوں نے آں حضرت ﷺ کے وصال کے بعد اپنی زندگیاں دین کی تعلیم و تبلیغ کے لیے وقف کردیں۔ وہ جہاں بھی رہیں لوگوں کو فیض پہنچاتی رہیں۔ بہت سے مسائل، جن کا حل بتانے سے فقہائے صحابہ بھی قاصر رہتے تھے، ازواجِ مطہرات نبی ﷺ سے خاص تعلق رکھنے کی وجہ سے بآسانی انھیں حل کردیتی تھیں۔ ان کا یہ فیض آں حضرت ﷺ کے بعد طویل عرصہ تک جاری رہا۔ اس کا اندازہ درج ذیل جدول سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے:

نمبر شمار	نام ام المومنین	حضورؐ سے نکاح کا زمانہ	مدّتِ رفاقت	سنہ وفات	حضورؐ کی وفات کے بعد کتنے سال زندہ رہیں؟
۱	حضرت سودہؓ	سنہ ۱۰ بعثت	۱۴ سال	۲۳ھ[1]	۱۲ سال
۲	حضرت عائشہؓ	سنہ ۱۰ بعثت (رخصتی شوال ۱ھ)	۹ سال	۵۷ھ	۴۶ سال

---

[1] حضرت سودہؓ کے سنہ وفات میں اختلاف ہے، سوانح نگاروں نے مختلف سنین مثلاً ۱۹ھ، ۲۳ھ، ۵۴ھ، ۵۵ھ بیان کیے ہیں

۳	حضرت حفصہؓ	سنہ ۳ھ	۸ سال	سنہ ۴۵ھ	۳۴ سال
۴	حضرت ام سلمہؓ	سنہ ۴ھ	۷ سال	سنہ ۶۱ھ	سنہ ۵۰ سال
۵	حضرت زینب بنت جحشؓ	سنہ ۵ھ	۶ سال	سنہ ۲۰ھ	۹ سال
۶	حضرت جویریہؓ	سنہ ۵ھ	۶ سال	سنہ ۵۳ھ	۴۲ سال
۷	حضرت ام حبیبہؓ	سنہ ۶ھ	۵ سال	سنہ ۴۴ھ[1]	۴۸ سال
۸	حضرت صفیہؓ	سنہ ۷ھ	۳ ۳/۴ سال	سنہ ۵۰ھ	۳۹ سال
۹	حضرت میمونہؓ	سنہ ۷ھ	۳ ۱/۴ سال	سنہ ۵۱ھ	۴۰ سال

اس طویل عرصہ میں صحابہ اور تابعین نے بہت بڑی تعداد میں ازواجِ مطہرات سے کسبِ فیض کیا اور انہوں نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ان کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے رہتے تھے اور جو شخص بھی چاہتا بلا روک ٹوک ان سے استفادہ کر سکتا تھا۔ اس منصب کا تقاضا تھا کہ انھیں ماؤں ہی کے درجے میں رکھا جائے اور انھیں یہی حیثیت دی جائے۔ کیوں کہ اسی حیثیت میں وہ اس فریضۂ منصبی کو زیادہ اچھی طرح ادا کر سکتی تھیں۔ اگر انھیں اس درجہ سے گرا دیا جاتا اور کوئی اور حیثیت دے دی جاتی تو وہ اپنے وقار کو قائم نہ رکھ سکتی تھیں اور دوسرے بھی ان سے اس طرح استفادہ نہ کر پاتے جس طرح معلّماتِ امت سے کرنا چاہیے۔

ایک وضاحت:

کتبِ سیرت میں بعض ایسی خواتین کے نام ملتے ہیں جنھیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغامِ نکاح دیا، لیکن کسی وجہ سے نکاح نہیں ہو پایا، یا ان سے نکاح تو ہو گیا، لیکن خلوت سے قبل ہی بعض اسباب سے علیحدگی اختیار کر لی[2]۔ ایسی خواتین کا شمار ازواجِ نبی اور

---

[1] حضرت ام حبیبہؓ کا سنہ وفات باختلافِ روایات سنہ ۴۴ھ، سنہ ۵۰ھ، سنہ ۵۵ھ، سنہ ۵۹ھ ہے۔

[2] علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ ایسی خواتین کی تعداد چار یا پانچ ہے۔ زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، مؤسسۃ الرسالۃ

[illegible]

امہات المومنین میں نہیں کیا گیا ہے۔ انھیں دوسرا نکاح کرنے کی اجازت تھی۔

ان خواتین میں سے ایک کا نام اسماء بنت نعمان ہے۔ یہ قبیلۂ کندہ کے سردار نعمان بن شراحیل کی صاحب زادی تھیں۔ سنہ ۹ ھ میں آں حضرت ﷺ نے ان سے نکاح کیا تھا، لیکن پھر بعض وجوہ سے طلاق دے دی تھی [۱]۔ اصحابِ سیر نے بیان کیا ہے کہ ان سے بعد میں مہاجر بن ابی امیہ المخزومی اور ان کے بعد قیس بن مکشوح المرادی نے نکاح کرلیا تھا۔ [۲]

☆ ☆ ☆

---

[۱] مذکورہ خاتون سے آنحضرت ﷺ کے نکاح اور پھر طلاق کی وجوہ پر تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے ایک استفسار پر راقم سطور کا جواب، ماہنامہ زندگی نو، نئی دہلی، فروری ۲۰۰۰ء، ص: ۶۸ـ۷۰

[۲] اسد الغابۃ، ابن الاثیر، ۱۷/۷، الاصابۃ فی تمییز الصحابہ، ابن حجر عسقلانی، مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۲۸ھ، ۲۳۳/۴، الاستیعاب، ابن عبد البر بھامش الاصابۃ، ۲۳۰/۴

آں حضرتؐ نے آزاد بیویوں کی موجودگی میں باندیاں کیوں رکھیں؟

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آزاد بیویوں کے رہتے ہوئے باندیوں کو اپنے مِلکِ یمین میں کیوں رکھا؟ اس اعتراض کا محرک یہ ہے کہ باندیوں کو سماج میں آزاد عورتوں کے مقابلے میں کم تر حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے آزاد بیویوں کے رہتے ہوئے ان سے تمتّع کرنے کا مقصد بڑھی ہوئی جنسی خواہش کی تسکین کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ گزشتہ صفحات میں آں حضرت ﷺ کی ازدواجی زندگی کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے وہ اس کی قطعی تردید کے لیے کافی ہے۔

اسلام نے غلامی کے رواج کو سخت ناپسند کیا ہے، لیکن اس کے یک لخت خاتمہ کے بجائے اس نے دیگر احکام کی طرح اس میں بھی تدریج ملحوظ رکھی ہے۔ اسلام نے غلاموں کو عام انسانی حقوق عطا کیے ہیں، غلاموں اور باندیوں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی ہے، بلکہ بہت سی صورتوں میں اس کو واجب العمل قرار دیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بعض سیاسی مصالح کی بنا پر غلامی کا وجود برداشت کیا ہے۔ اس زمانے میں ہونے والی جنگوں میں جو مرد اور عورتیں گرفتار کی جاتی تھیں انہیں غلام اور باندیاں بنالیا جاتا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس عرف کو باقی رکھا۔ اس زمانے میں مسلمان ایسے ہنگامی حالات سے گزر رہے تھے کہ ان کے پاس ایسے قید خانے نہیں تھے جہاں جنگی قیدیوں کو رکھا جاسکے اور ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا سرکاری انتظام کیا جاسکے۔ اس لیے مناسب خیال

کیا گیا کہ قیدی مردوں اور عورتوں کو فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کے بنیادی حقوق کی نگہداشت کرنے اور ان کا پورا خیال رکھنے کی تاکید کر دی جائے۔

بعض جنگوں میں قید ہو کر آنے والی بعض خواتین سردارانِ قبائل کے خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے مقام و مرتبہ کا خیال کر کے آں حضرت ﷺ نے از خود یا بعض صحابہ کے مشورے سے انہیں اپنے لیے خاص کر لیا۔ ایسا کرنے سے ان قبائل کی عداوتیں ختم ہو گئیں اور وہ پھر کبھی مقابلہ پر نہیں آئے۔ غزوۂ بنو مصطلق (۵ھ) کے قیدیوں میں سردارِ قبیلہ حارث بن ابی ضرار کی بیٹی برّہ (جویریہؓ) بھی تھیں۔ مالِ غنیمت تقسیم ہوا تو وہ حضرت ثابت بن قیسؓ یا ان کے چچازاد بھائی کے حصے میں آئیں۔ برّہ نے ان سے یہ معاملہ طے کر لیا کہ وہ کچھ مال لے کر انہیں آزاد کر دیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ اتنا مال فراہم کر کے انہیں آزاد کروا دیں۔ آپؐ نے مطلوبہ رقم اپنی طرف سے ادا کر دی اور انہیں ان کی مرضی سے اپنی زوجیت میں لے لیا[1]

اسی طرح غزوۂ خیبر (۷ھ) کے اسیران میں یہودی قبیلہ بنو نضیر کے سردار حی بن اخطب کی بیٹی زینب (صفیہؓ) تھیں۔ مالِ غنیمت اور اسیرانِ جنگ کی تقسیم کے وقت وہ حضرت دحیہ کلبیؓ کے حصے میں آئیں۔ بعض صحابہ نے متوجہ کیا کہ اے اللہ کے رسول یہ بنو نضیر کے ایک معزز سردار کی بیٹی ہیں۔ یہ صرف آپ کے لیے موزوں ہیں۔ آں حضرت ﷺ نے حضرت دحیہؓ کو ایک دوسری باندی دے کر صفیہ کو واپس لے لیا اور انہیں آزاد کر کے اپنی زوجیت کا شرف بخشا[2]

ایسا ہی معاملہ حضرت ریحانہ بنت شمعونؓ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ وہ بنو قریظہ کے سردار شمعون بن زید کی بیٹی تھیں۔ اس قبیلہ کی بدعہدی کی وجہ سے مسلمانوں نے اس کے خلاف فوج کشی کی اور اسے شکست دے کر مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ اسیرانِ جنگ میں حضرت ریحانہ بھی تھیں۔ انہیں آں حضرت ﷺ کے سامنے لایا گیا اور آپ کو بتایا گیا کہ یہ سردارِ قبیلہ کی بیٹی ہیں۔ آپؐ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا، مگر انہوں نے اسے قبول

---

[1] سیرۃ النبی، ابن ہشام، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ قاہرہ، ۱۹۳۷ء، ۳۳۹/۳

[2] سیرت ابن ہشام، ۳۸۱/۳، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، ابن اثیر الجزری، دار الشعب قاہرہ، ۱۶۹/۷

کرنے سے انکار کیا۔ آں حضرت ﷺ کو ان کا انکار پسند نہیں آیا۔ لیکن جلد ہی آپ کو ان کے اسلام قبول کر لینے کی اطلاع ملی جس سے آپ کو خوشی ہوئی۔ آپؐ نے ان کے سامنے پیش کش کی کہ اگر ان کی مرضی ہو تو آپ ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیں۔ انہوں نے جواب دیا: ''اے اللہ کے رسول مجھے اپنی مملوکہ ہی رہنے دیں۔ یہ میرے لیے آسان ہے اور آپ کو بھی اس میں سہولت ہوگی۔'' چناں چہ آپؐ نے انہیں اسی حال میں رہنے دیا۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی دوسری باندی حضرت ماریہؓ تھیں۔ صلح حدیبیہ (۷ ھ) کے بعد آں حضرت ﷺ نے مختلف ملکوں کے حکم رانوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے خطوط روانہ کیے تو مصر کے عیسائی حکم راں مقوقس کے پاس حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کو خط دے کر بھیجا تھا۔ مقوقس نے آپؐ کے سفیر اور مکتوب کے ساتھ عزت واحترام کا برتاؤ کیا۔ اپنے جوابی خط کے ساتھ اس نے کچھ تحائف بھیجے جن میں دو لڑکیاں (ماریہ اور سیرین) بھی تھیں۔ اس نے اپنے خط میں یہ بھی ذکر کیا تھا کہ مصر میں ان لڑکیوں کو بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ (**وبعثت الیک بجاریتین لهما مكان في القبط عظيم**[2]) گویا یہ شاہی کنیزیں تھیں جنہیں مقوقس نے خاص طور پر رسول ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ یہ دونوں سگی بہنیں تھیں۔ چوں کہ اسلام میں دو سگی بہنیں ایک شخص کے پاس نہیں رہ سکتی تھیں اس لیے آں حضرت ﷺ نے ماریہؓ کو اپنے پاس رکھا اور سیرین کو حضرت حسان بن ثابتؓ کو دے دیا۔

☆ ☆ ☆

---

[1] سیرت ابن ہشام، ۲۶۴/۳۔ ۲۶۵، الطبقات الکبریٰ لابن سعد، دار صادر بیروت ۱۹۵۸ء، ۱۳۱/۸۔ ابن سعد نے بعض روایتیں ایسی نقل کی ہیں جن میں صراحت ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت ریحانہ کو آزاد کر کے انھیں اپنی زوجیت میں لے لیا تھا۔ لیکن اکثر اصحابِ سیر نے انھیں مملوکہ قرار دیا ہے۔

[2] طبقات ابن سعد، ۲۶۰/۱، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، د۔ محمد حمید اللہ، مطبع لجنۃ التألیف والترجمۃ والنشر قاہرہ، ۱۹۴۱ء

حضرت عائشہؓ کی کم سنی کی شادی پر اعتراضات

ام المومنین حضرت عائشہؓ کی کم سنی کی شادی بھی ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت سے حضرات اعتراض کرتے ہیں۔ جس زمانہ میں آں حضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا اس وقت آپ ؐ کی عمر پچاس سال اور حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال تھی۔ تین سال کے بعد ان کی رخصتی ہوئی تو اس وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ معترضین کہتے ہیں کہ زوجین کی عمروں میں اتنا تفاوت نامناسب ہے۔ بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ اتنی کم سن لڑکی اس قابل نہیں ہوتی کہ اس سے جنسی تعلق قائم کیا جائے[1]۔ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی رفاقت میں نو سال گزارے۔ اس طرح اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں اور اپنی عمر کے تقریباً ۴۶ سال بیوگی کی حالت میں گزارے۔ بعض لوگ یہ بھی اعتراض اٹھاتے ہیں کہ کسی ایسی لڑکی کو، جو اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی ہو، آئندہ کسی سے نکاح کرنے کے حق سے محروم کر دینا اس پر ظلمِ عظیم ہے۔

زوجین میں اصل باہمی موافقت ہے:

زوجین کے درمیان عمروں میں زیادہ تفاوت کو اس لیے نامناسب خیال کیا

---

[1] شاید ایسے ہی اعتراضات سے بچنے کے لیے بعض محققین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح سولہ سال کی عمر میں اور رخصتی انیس سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس نقطۂ نظر کی تردید کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے: ''حضرت عائشہؓ نکاح کے وقت چھ برس کی اور رخصتی کے وقت نو برس کی تھیں۔ اسلام کے پورے تاریخی سرمایہ میں ایک حرف بھی اس کے خلاف نہیں ہے۔'' اس موضوع پر ان کا تحقیقی مقالہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مقالہ ان کی کتاب ''سیرت عائشہؓ '' کے پاکستانی ایڈیشن میں شامل کر دیا گیا ہے۔ طبع لاہور، ص۳۱۳_۳۶۶

جاتا ہے، کیوں کہ یہ چیز عموماً ان کے مابین خوش گوار ازدواجی تعلقات اور مزاجوں میں موافقت وہم آہنگی میں حارج ہوتی ہے۔ لیکن خوش گوار معاشرت کے لیے ہم سنی ضروری نہیں ہے۔ ہندومت کی کتابوں سے بھی اس کا اثبات ہوتا ہے، منوسمرتی میں ہے: "تیس برس کی عمر کا لڑکا اور بارہ برس کی دختر کا وواہ کرے یا چوبیس برس کا لڑکا اور آٹھ برس کی لڑکی کا وِواہ کرے"[۱]

اللہ کے رسول ﷺ کے ازدواجی تعلقات حضرت عائشہؓ کے ساتھ انتہائی خوش گوار اور مثالی تھے۔ دونوں کے درمیان غایت درجہ محبت پائی جاتی تھی۔ عمروں میں تفاوت کے باوجود نو سالہ رفاقت میں ان کے درمیان ناموافقت اور بے اطمینانی کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ حضرت عائشہؓ اللہ کے رسول ﷺ کی سب سے چہیتی بیوی تھیں۔ دوسروں کو بھی اس کا احساس تھا۔ اس معاملے میں آپ تک شکایت پہنچائی گئی تو آپؐ نے فرمایا: "لا تؤذيني في عائشة" (عائشہ کے معاملے میں مجھے دق نہ کرو)[۲]۔ احادیث میں وہ تمام تفصیلات موجود ہیں کہ کس طرح آں حضرت ﷺ ان کی دل جوئی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کو بھی حضورؐ سے بہت محبت تھی۔ اس کا اندازہ ان واقعات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبت کے مقابلے میں کسی دوسرے کی محبت کو گوارا نہیں کرسکتی تھیں۔[۳]

اسلامی نقطۂ نظر سے اگرچہ زوجین کا ہم سن ہونا پسندیدہ ہے[۴] لیکن اسے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ بلکہ اس کے بجائے زوجین کو ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ عہدِ صحابہ میں اس طرح کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ لوگ بعض اسباب سے عمروں کا فرق نظر انداز کرتے ہوئے کم سن لڑکیوں سے نکاح کر لیتے تھے، مثلاً حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت علیؓ کی صاحب زادی حضرت ام کلثومؓ سے ۱۷ھ میں نکاح کیا۔ اس وقت حضرت ام کلثومؓ کی عمر نو دس سال اور فاروق اعظمؓ کی عمر پچپن سال سے زائد

---

[۱] منوسمرتی، باب ۹، اشلوک ۹۴، بحوالہ مقدس رسول، ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری، طبع دہلی ۱۹۶۰ء، طبع سوم، ص: ۷۹

[۲] سنن نسائی، کتاب عشرۃ النساء، باب حب الرجل بعض نسائه أكثر من بعض

[۳] اس موضوع پر تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے۔ سیرت عائشہؓ، سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی منزل اعظم گڑھ، طبع دہم ۱۹۹۶ء

[۴] اس موضوع پر ملاحظہ کیجیے مولانا سلطان احمد اصلاحی کا رسالہ "کم سنی کی شادی اور اسلام" شائع کردہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

تھی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے اس خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے جواب دیا: "انھا صغیرۃ" (وہ تو ابھی کم سن ہے) لیکن جب حضرت عمرؓ نے واضح کیا کہ ان کا مقصد خاندانِ نبوت سے انتساب کا شرف حاصل کرنا ہے تو حضرت علیؓ تیار ہو گئے۔ ان سے حضرت عمرؓ کی دو اولادیں ہوئیں۔[1]

حضرت عائشہؓ سے اللہ کے رسول ﷺ کے نکاح کا مقصد جہاں ایک طرف اپنے قریبی رفیق اور جاں نثار حضرت ابو بکرؓ سے تعلقات کو مزید استحکام بخشنا تھا، وہیں حضرت عائشہؓ کی ذاتی خصوصیات اور فطری صلاحیتیں بھی انھیں اس شرف کا مستحق ٹھہراتی تھیں۔

بلوغ کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی:

یہ صحیح ہے کہ کم سن لڑکی کا نکاح اس وقت کرنا پسندیدہ ہے جب وہ اس قابل ہو جائے کہ اس سے مخصوص ازدواجی تعلق قائم کیا جا سکے۔ اس کا لحاظ نہ کرنے میں بہت سے نقصانات ہیں جن کا کم سن لڑکی اور مرد دونوں شکار ہوتے ہیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ بلوغ کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ جسمانی نشو و نما، غذائیت، ذہنی پرورش، خاندان، آب و ہوا اور دیگر عوامل ہیں جو بلوغ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے کوئی لڑکی جلدی بالغ ہو جاتی ہے اور کوئی دیر میں۔ اس لیے بلوغ کی ایک عمر متعین کر کے اس سے کم عمر کی ہر لڑکی کو نابالغ سمجھ لینا صحیح نہیں۔

طبی تحقیقات اور آئے دن اخبارات کی زینت بننے والے واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ چند ماہ قبل ٹائمز آف انڈیا نئی دہلی میں شائع شدہ ایک خبر کے مطابق برطانیہ کی ایک بارہ سالہ لڑکی کو "سب سے کم عمر ماں" (Young mother) اور ایک چوبیس سالہ خاتون کو "سب سے کم عمر دادی" (young grand mother) کا خطاب مل چکا ہے۔

۱۹۹۰ء میں مغربی ترکی کے ایک قصبہ افیون میں ایک نو سالہ لڑکی نے ایک صحت مند

---

[1] اسد الغابۃ، ۷/ ۳۸۷، مزید ملاحظہ کیجیے طبقات ابن سعد، ۸/ ۴۶۳-۴۶۴ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ابن عبد البر، مکتبۃ نھضۃ مصر و مطبعتھا، الفجالۃ مصر، ۴/ ۱۹۵۴-۱۹۵۶

بچے کو جنم دیا۔ ڈاکٹروں نے آپریشن کے ذریعہ اس بچے کی ولادت کرائی، تا کہ دورانِ ولادت زچہ اور بچہ دونوں کی جانوں کو کوئی خطرہ نہ رہے [1]۔ ایک دوسری خبر کے مطابق ۱۹۹۳ء میں شمالی میکسیکو کی ایک آٹھ سالہ لڑکی نے نیشنل میڈیکل سنٹر آف ویسٹ ہاسپٹل گوادالاجار (Guadalajara) میں ایک صحت مند بچے کو جنم دیا۔ اس کا وزن ۳ء۲ کلو تھا اور اس کی ولادت معمول کے نو ماہ کے حمل کے بعد ہوئی تھی [2]۔

عرب کی آب و ہوا گرم ہے۔ وہاں کی عمرِ بلوغ کو سرد آب و ہوا والے ممالک میں لڑکیوں کی عمر پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔ ویسے بھی حضرت عائشہؓ کے سلسلے میں روایات میں آتا ہے کہ بچپن میں ان کی نشو و نما بہت اچھی تھی اور وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑی لگتی تھیں۔

حضرت عائشہؓ کا ایک قول ہے:

اذا بلغت الجارية تسع سنين فهي امرأةٌ [3]

لڑکی نو سال کی ہو جائے تو وہ عورت ہو جاتی ہے۔

اس بیان کو اگر عرب میں عمر بلوغ کی حد کے طور پر قبول نہ کیا جائے تو کم از کم اسے حضرت عائشہؓ کی اپنی ذات کے بارے میں ضرور تسلیم کرنا چاہیے۔

حضرت عائشہؓ کی ذات سے امت کو حاصل ہونے والے فائدے:

حضرت عائشہؓ اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں اور بقیہ عمر انہوں نے اسی حالت میں گزار دی۔ بظاہر یہ بڑا ظلم معلوم ہوتا ہے کہ ایک لڑکی جو عین عالمِ شباب میں بیوہ ہوگئی ہو، اسے دوبارہ نکاح کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ لیکن وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ شبہ باقی نہیں رہتا۔ اوپر گزر چکا ہے کہ آں حضرت ﷺ کی وفات کے بعد ازواجِ مطہرات کو دوسرے نکاح کا حق نہ دینے کی کیا حکمت تھی۔ حضرت عائشہ نے دین کی تعلیم و اشاعت کی جو غیر معمولی خدمت انجام دی ہے وہ پوری امتِ مسلمہ پر ان کا عظیم احسان

---

[1] ملاحظہ کیجیے انگریزی روز نامہ انڈین ایکسپریس نئی دہلی اور روز نامہ قومی آواز نئی دہلی، ۱۵؍ مارچ ۱۹۹۰ء

[2] روز نامہ ٹائمز آف انڈیا، نئی دہلی اور روز نامہ قومی آواز نئی دہلی، ۱۶؍ جنوری ۱۹۹۳ء (مذکورہ دونوں حوالوں کی فراہمی کے لیے راقم سطور محترم مولانا سلطان احمد اصلاحی کا شکر گزار ہے)

[3] جامع ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی اکراہ الیتیمۃ علی التزویج

ہے۔ ان میں ذہانت وفطانت کے آثار بچپن سے نمایاں تھے۔ انھوں نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے جاں نثار اور علم انساب وشعر کے ماہر باپ کے گھر میں پرورش پائی تھی۔ کم سنی میں ہی کاشانۂ نبوت میں پہنچ جانے کی وجہ سے آں حضرت ﷺ کے دائمی فیضانِ صحبت نے ان کی فطری صلاحیتوں میں چار چاند لگا دئے تھے۔ ان کا حجرہ مسجدِ نبوی سے متصل ہونے کی وجہ سے روزانہ مسجد میں منعقد ہونے والی آں حضرت ﷺ کی تعلیم و ارشاد کی مجلسوں سے بھی استفادہ کرتی تھیں اور خود بھی جس مسئلہ میں ذرا سا اشکال محسوس کرتیں بلا تامل آں حضرت ﷺ سے دریافت کرلیا کرتی تھیں۔ آپؐ خود بھی ان کی ایک ایک ادا اور ایک ایک حرکت کی نگرانی فرماتے تھے اور جہاں کوئی بات شریعت سے غیر ہم آہنگ پاتے، تنبیہ فرمادیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کتاب وسنت کے علم اور احکامِ الٰہی کی معرفت میں جماعتِ صحابہ وصحابیات میں ممتاز نظر آتی ہیں۔ آں حضرت ﷺ کی وفات کے بعد انہیں مرجعیت کا مقام حاصل تھا۔ صحابہ وصحابیات اور دیگر مسلمان مرد و خواتین اپنے مختلف مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ تعلیم وارشاد کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں اور تشنگانِ علم دور دراز سے آ کر ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے۔ محرم (جن سے پردہ نہ تھا) گھر کے اندر بیٹھ کر رُو برُو اور نامحرم مسجد نبوی میں بیٹھ کر پردہ کی اوٹ سے ان سے استفادہ کرتے تھے۔ تعلیمِ دین کا یہ سلسلہ آں حضرت ﷺ کی وفات کے بعد تقریباً نصف صدی تک جاری رہا۔ اس طرح حضرت عائشہ کی ذات سے امت کو جو عظیم فائدہ پہنچا اس میں کوئی ان کا شریک نہیں۔

بالفرض اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت عائشہؓ کو دوسرے نکاح کی اجازت نہ دے کر ان کی حق تلفی کی گئی تو امت کے اجتماعی مفاد کو دیکھتے ہوئے ایسی حق تلفی کو گوارا کیا جاسکتا ہے اور گوارا کیا گیا۔ کسی مشن کا استحکام، عروج اور توسیع اس سے وابستہ افراد سے قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کی راہ میں کسی ایک فرد کی قربانی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

☆ ☆ ☆

نکاحِ زینبؓ کا واقعہ

حیاتِ طیبہ میں ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ کا واقعہ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینبؓ کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ سے کر دیا تھا، لیکن نباہ نہ ہو سکا اور حضرت زیدؓ نے انہیں طلاق دے دی تو ان سے حضور نے خود نکاح کر لیا۔

اس سیدھے سادے واقعہ میں مخالفینِ اسلام نے خوب خوب رنگ آمیزی کی ہے اور آں حضرت ﷺ کی پاکیزہ سیرت کو داغ دار کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ سطورِ ذیل میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جا رہی ہے، تا کہ حقیقت واضح ہو سکے۔

حضرت زیدؓ کون تھے:

حضرت زیدؓ کا تعلق قبیلۂ کلب سے تھا۔ بچپن میں ایک مرتبہ ان کے قبیلہ کے پڑاؤ پر دشمنوں نے حملہ کیا اور لوٹ مار کے ساتھ جن لوگوں کو غلام بنا کر لے گئے ان میں زید بھی تھے۔ پھر انہوں نے انہیں عکاظ کے بازار میں بیچ دیا۔ حکیم بن حزامؓ نے انہیں خرید کر اپنی پھوپی حضرت خدیجہؓ کو ہبہ کر دیا۔ پھر جب حضرت خدیجہؓ کا نکاح آں حضرت ﷺ سے ہوا تو انہوں نے زیدؓ کو آپؐ کی نذر کر دیا۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر آٹھ سال تھی۔ حضور کے یہاں انہیں ایسی محبت ملی کہ وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے اور بعد میں ایک موقع پر جب ان کے باپ اور چچا انہیں ڈھونڈتے ہوئے آ پہنچے اور حضور کی اجازت سے انہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو انہوں نے انکار کر دیا اور آزادی پر حضور کی

غلامی کو ترجیح دی۔ یہ دیکھ کر حضور نے انہیں آزاد کر دیا اور انہیں اپنا متبنّٰی (منہ بولا بیٹا) بنا لیا۔ یہ بعثت سے پہلے کا واقعہ ہے[۱]۔

آں حضرت ﷺ کی جانب سے دعویٰ نبوت سنتے ہی جن چار ہستیوں نے بغیر کسی ادنیٰ شک وتردّد کے اسے فوراً تسلیم کر لیا تھا، حضرت زیدؓ ان میں سے ایک تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے منظورِ نظر اور معتمدِ خاص تھے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد آپؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کرائی تھی۔ اس موقع پر آپؐ نے استثنائی صورت میں حضرت زیدؓ اور اپنے محبوب چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلبؓ (دونوں مہاجر) کو بھائی بھائی قرار دیا تھا[۲]۔ غزوۂ بدر سے قبل غزوۂ سفوان (غزوۂ بدر الاولی) میں آں حضرت ﷺ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ نکلے تو ان ہی کو مدینہ کا عامل بنایا تھا[۳]۔ غزوۂ بدر میں جب اللہ تعالی کی تائید ونصرت سے مسلمانوں کو فتحِ عظیم حاصل ہوئی تو اہلِ مدینہ کو اس کی خوش خبری دینے کے لیے آں حضرت ﷺ نے انہی کو بھیجا تھا[۴]۔ غزوۂ بدر کے بعد آں حضرت ﷺ نے اپنی صاحب زادی حضرت زینبؓ کو مکہ سے لانے کے لیے حضرت زیدؓ ہی کو مامور کیا تھا[۵]۔ متعدد مواقع پر آپؐ نے ان کی سربراہی میں سرایا روانہ کیے تھے[۶]۔ بلکہ حضرت عائشہؓ تو یہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ کو جس سریہ میں بھی بھیجا اس کی سربراہی انہی کے حوالے کی[۷]۔ آں حضرت ﷺ نے ان کا نکاح اپنی دایا ام ایمن سے کر دیا تھا۔ ان سے حضرت اسامہؓ پیدا ہوئے تھے[۸]۔

حضرت زینبؓ کا حضرت زیدؓ سے نکاح اور علیحدگی:

حضرت زیدؓ کی عزت افزائی کے لیے آں حضرت ﷺ نے چاہا کہ ان کا نکاح

---

[۱] اسد الغابۃ، ۲/۲۸۱

[۲] سیرت ابن ہشام، ۲/۱۲۴

[۳] حوالہ سابق، ۲/۲۳۸

[۴] حوالہ سابق، ۲/۲۸۵

[۵] حوالہ سابق، ۲/۲۹۷

[۶] حوالہ سابق، ۲/۴۲۹، ۴/۲۸۴، ۲۸۵، ۲۹۰، ۳۱۲۔

[۷] اسد الغابۃ، ۲/۲۸۳

[۸] حوالہ سابق

حضرت زینبؓ سے کردیں۔ حضرت زینبؓ کے عزیزوں کو یہ رشتہ پسند نہ تھا، لیکن آں حضرت ﷺ نے اصرار کیا تو تیار ہوگئے اور نکاح ہوگیا۔ آں حضرت ﷺ نے حضرت زیدؓ کی طرف سے مہر ادا کیا اور گھر بسانے کے لیے ضروری ساز و سامان بھی فراہم کیا۔ حضرت زینبؓ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں اس رشتہ کو منظور تو کرلیا تھا، لیکن حسب ونسب میں اپنی برتری کے احساس کو وہ اپنے دل سے کسی طرح نہ مٹا سکی تھیں۔ عین ممکن ہے کہ منافقین کے برپا کردہ فتنہ انگیز ماحول میں ان کے اس احساس میں اضافہ ہوا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زوجین کے درمیان خوش گوار معاشرت قائم نہ رہ سکی اور کشیدگی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ حضرت زیدؓ نے ارادہ کرلیا کہ طلاق دے کر اس قضیہ کا خاتمہ کردیں۔ چوں کہ یہ نکاح حضور ﷺ کے مشورہ اور ایماء سے ہوا تھا اس لیے انہوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے ارادہ کا اظہار کیا۔

آں حضرت ﷺ نے حضرت زیدؓ کو ان کے اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ آپؐ نے یہ نکاح اعلیٰ وارفع مقصد کے لیے کروایا تھا، اس لیے آپ کی خواہش تھی کہ وہ قائم رہے۔ آپؐ نے حضرت زیدؓ کو اللہؑ کا خوف دلاتے ہوئے ارادۂ طلاق سے روکنے کی کوشش کی (الاحزاب: ۳۷) یہ آپ ﷺ کا حکم نہیں، بلکہ ناصحانہ مشورہ تھا جسے قبول کرنے یا نہ کرنے میں وہ آزاد تھے۔ حالات کے دباؤ کی بنا پر وہ خود کو اس پر آمادہ نہ کرسکے اور انہوں نے طلاق دے دی۔

حضورؐ کا حضرت زینبؓ سے نکاح:

حضرت زیدؓ کے طلاق دینے کے بعد حضرت زینبؓ کی دل جوئی کی صورت یہ رہ گئی تھی کہ آپ خود ان سے نکاح کرلیں۔ لیکن آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ ایسا کرنے سے مخالفین کو فتنہ برپا کرنے کا موقع ہاتھ آجائے گا۔ آپ کے لیے یہ امر بھی پریشانی کا باعث تھا کہ عام مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھنے کا حکم نازل ہوچکا تھا اور اس وقت آپ کے نکاح میں بھی چار ازواج تھیں (اس وقت تک اس حکم سے آپ کو مستثنیٰ کرنے والی آیت نازل نہیں ہوئی تھی) ان وجوہ سے آپؐ حضرت زینبؓ سے نکاح کے

سلسلے میں متردّد تھے۔ سورۂ احزاب کی آیت: ۳۷ **وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَتَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاهُ** (اس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا۔ تم لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے ڈرو) میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ بالآخر وحیِ الٰہی نے آپ کا یہ تردّد ختم کر دیا اور صاف الفاظ میں حکم دے دیا گیا کہ لوگوں کی مخالفت کی پروا کیے بغیر آپ یہ نکاح کر لیں۔

مخالفین کا فتنہ:

اس واقعہ پر عہدِ نبوی میں بھی مخالفینِ اسلام نے فتنہ پھیلانے کی کوشش کی تھی اور بعد میں بھی اس کو بنیاد بنا کر طرح طرح کے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ حضرت زینبؓ سے حضرت زیدؓ کے نکاح پر عہدِ نبوی میں منافقوں اور دوسرے اسلام دشمنوں نے یہ فتنہ برپا کیا کہ ایک آزاد کردہ غلام، جو سماجی اعتبار سے فروتر حیثیت رکھتا ہے، اس کا نکاح ایک معزز خاندان سے کر کے اس (خاتون) کے وقار اور عزتِ نفس کو پامال کر دیا گیا ہے۔ پھر جب حضرت زیدؓ کے طلاق دینے کے بعد حضرت زینبؓ سے آں حضرت ﷺ نے نکاح کر لیا تو ان بد باطنوں نے اس کو بھی آں حضرت ﷺ کے خلاف شر انگیزی کا ذریعہ بنایا اور کہا کہ محمد (ﷺ) نے تو اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلّقہ کے ساتھ نکاح کر لیا ہے، جو عرب سماج کی معروف روایت کے خلاف ہے۔ حالاں کہ دونوں موقعوں پر حضرت زینبؓ کے نکاح سے اسلام کی اہم اور بنیادی تعلیمات کا اظہار ہوا۔

رسول اللہ ﷺ نے جاہلیت کی غلط رسوم کو ختم کیا:

اسلام میں عہدِ جاہلیت کی بعض رسوم اور اقدار کو باقی بھی رکھا گیا ہے، لیکن اس عہد میں جو تصوّرات و افکار اور رسوم و اقدار اسلام کے بنیادی احکام اور تعلیمات سے ٹکراتے تھے ان کی اصلاح بھی کی گئی ہے۔ نکاحِ زینبؓ کے ذریعہ بھی بعض جاہلی تصورات اورسوم کی اصلاح کی گئی۔

عرب معاشرہ میں غلاموں اور موالی (آزاد کردہ غلاموں) کو سماجی حیثیت سے

پست مقام حاصل تھا۔ اسلام نے انسانوں اور انسانوں کے درمیان سارے امتیازات باطل قرار دیے اور اعلان کر دیا کہ تمام انسان ایک ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں، اس لیے سب برابر ہیں اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو اس سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہو (الحجرات۔۱۳) اللہ کے رسول ﷺ نے بھی برسرِ عام اعلان فرمایا: ''عربی، عجمی، کالے، گورے، کسی شخص کو کسی دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، اگر ہے تو صرف تقوی کی بنیاد پر''[1] آں حضرت ﷺ چاہتے تھے کہ غلاموں کے بارے میں لوگوں کے اس تصور میں تبدیلی آئے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے باصرار حضرت زیدؓ سے حضرت زینبؓ کا نکاح کروایا تھا۔

اسی طرح عہدِ جاہلیت میں منہ بولے بیٹے کو صلبی بیٹے کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ میراث میں اس کا حصہ لگایا جاتا تھا اور دیگر سماجی معاملات میں بھی اس کے ساتھ صلبی بیٹے جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ چناں چہ کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اس کا منہ بولا بیٹا اگر وفات پا جائے یا طلاق دے دے تو اس کی (سابقہ) بیوی سے وہ نکاح کر سکے۔ اسلام کی نظر میں یہ ایک غلط جاہلی رسم تھی، کیوں کہ یہ فطری عائلی نظام کے برعکس تھی۔ منہ بولے بیٹے صلبی بیٹوں کے مثل نہیں ہو سکتے۔ قرآن کہتا ہے:

وَمَاجَعَلَ اَدْعِيَاءَ كُمْ اَبْنَاءَ كُمْ (الأحزاب: ۴)

اور نہ اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے۔

حضرت زیدؓ کو رسول اللہ ﷺ نے منہ بولا بیٹا بنالیا تھا۔ جب انہوں نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی تو اس غلط جاہلی رسم کی اصلاح کا ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ چناں چہ اللہ تعالی نے اپنے رسول کو ہدایت کی کہ لوگوں کے اعتراضات اور شر انگیزیوں کی پروا کیے بغیر حضرت زینبؓ سے نکاح کر لیں، تاکہ آپؐ کے عمل کے ذریعہ اس غلط رسم کی اصلاح ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَراً زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ
حَرَجٌ فِي اَزْوَاجِ اَدْعِيَائِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَراً (الأحزاب: ۳۷)

---

[1] مسند احمد، ۴۴۱/۵

> پھر جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا، تا کہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے، جب کہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں۔

ایک اور اعتراض:

بعض لوگوں نے اس واقعہ کو بنیاد بنا کر ایک افسانہ یہ تراشا ہے کہ نعوذ باللہ محمد (ﷺ) بہو کو دیکھ کر اسے دل دے بیٹھے تھے اور اس پر ریجھ گئے تھے۔ سعادت مند بیٹے کو کسی طرح اس تعلقِ خاطر کا علم ہو گیا تو اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ اس کے بعد باپ نے بہو سے شادی رچالی۔

اس اعتراض کی غیر معقولیت:

یہ کہنا بھی سراسر بے بنیاد ہے۔ حضرت زینبؓ آں حضرت ﷺ کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی صاحب زادی تھیں۔ بعثت سے سترہ سال قبل ان کی ولادت ہوئی تھی۔ ان کا بچپن اور جوانی سب رسول اللہ ﷺ کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ وہ ابتدائی دور میں اسلام لانے والوں میں سے تھیں۔ انہوں نے اپنے بھائی عبداللہ بن جحشؓ کے ساتھ مدینہ ہجرت کی تھی[1]۔ اگر حضور ﷺ کے دل میں واقعی حضرت زینبؓ کی طرف میلان ہوتا تو حضرت زیدؓ کے لیے نکاح کا پیغام دینے، پھر باصرار اس رشتے کو طے کرانے کی ضرورت کیا تھی؟ اس کے بجائے آپ شروع ہی میں ان سے نکاح کر سکتے تھے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو ان کے گھر والے بخوشی تیار ہو جاتے اور اسے اپنی سعادت سمجھتے۔

☆ ☆ ☆

---

[1] اسد الغابۃ، ۷/۱۲۵۔ سیرت ابن ہشام، ۲/۸۱

خانۂ کعبہ کی اہمیت و مرکزیت

مسلمانوں کے نزدیک خانۂ کعبہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ وہ ان کی عقیدتوں کا مرکز ہے۔ ان کے دل اس کی زیارت اور دیدار کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ اس کا حج اسلامی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ دنیا کے تمام مسلمان اس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے ہیں۔ اس کے پاس (مسجدِ حرام میں) نماز کی ادائیگی کا ثواب دنیا کی دیگر مساجد میں نماز کے ثواب سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اسی لیے وہاں نماز کی ادائیگی کے مقصد سے سفر جائز قرار دیا گیا ہے۔

خانۂ کعبہ کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے؟ یہ بات بہت سے غیر مسلموں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اسی لیے وہ اس پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ یہاں ان میں سے بعض اعتراضات کا جائزہ مقصود ہے۔

خانۂ کعبہ اللہ کا گھر:

خانۂ کعبہ کو اللہ کے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ ان کے عہد میں شرک اور بت پرستی کا بڑا زور تھا۔ دعوتِ توحید کے نتیجے میں ہی انہیں اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔ وہ جہاں بھی تشریف لے گئے وہاں انہوں نے اللہ واحد کے لیے عبادت خانہ قائم کیا۔ آخر میں انہوں نے مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں اللہ کے حکم اور نشان دہی پر خانۂ کعبہ کی تعمیر کی۔

قرآن کریم میں خانۂ کعبہ کے لیے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً "البیت الحرام"

(محترم گھر) "البیت العتیق" (قدیم گھر) اور "البیت المعمور" (آباد گھر)۔ اسے اللہ کا گھر بھی کہا گیا ہے۔ بعض حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ کعبہ کو اللہ کا گھر کس حیثیت سے کہا جاتا ہے؟ اللہ تو کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے۔ صرف ایک گھر کو اس سے منسوب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا اللہ اس میں رہتا ہے؟ لیکن مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق تو اللہ ہر جگہ موجود ہے۔

کعبہ کو اللہ کا گھر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے توحید کے ایک مرکز کے طور پر قائم کیا گیا ہے۔ اس وقت دنیا میں ہر طرف شرک کا بول بالا تھا اور بتوں کی پرستش کی جاتی تھی۔ حضرت ابرہیم علیہ السلام نے اسے اس لیے تعمیر کیا کہ یہاں صرف اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ اسے تعمیر کرنے کا اللہ نے حکم دیا تھا۔ اس کا ارشاد ہے:

وَاِذْ بَوَّانَا لِاِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَا تُشْرِكَ بِيْ شَيْئًا وَطَهِّرْ
بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْقَائِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (الحج۔۲۶)

یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ کہ) میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو مکہ میں لا بسایا تو اللہ تعالیٰ سے یہی عرض کی کہ اس محترم گھر کے پاس اسے بسانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ صرف تیری عبادت کریں:

رَبَّنَا اِنِّي اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ
الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (ابراهيم۔۳۷)

پروردگار میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار، یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔

اسی معنی میں مسجد کو بھی اللہ کا گھر کہا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

مَا اجْتَمَعَ قوم في بيت من بيوت الله يتلون كتاب الله ويتدارسونه بينهم الا حفّتهم الملائكة، ونزلت عليهم السكينة، وغشيتهم الرحمة[1]

جو لوگ اللہ کے کسی گھر میں اکٹھا ہو کر اس کی کتاب کی تلاوت اور اس کا اجتماعی مطالعہ کرتے ہیں انہیں فرشتے اپنے حلقے میں لے لیتے ہیں، ان پر سکینت نازل ہوتی ہے اور رحمتِ الٰہی انھیں ڈھانپ لیتی ہے۔

طواف کی حکمت:

حج کا ایک رکن طواف ہے۔ کوئی شخص جب حج کے ارادہ سے مکہ پہنچتا ہے تو سب سے پہلے خانۂ کعبہ کا طواف کرتا ہے۔ اسے طوافِ افاضہ کہتے ہیں۔ اسی طرح جب وہ اپنا حج مکمل کر کے وطن واپس ہونا چاہتا ہے تو آخر میں پھر طواف کرتا ہے۔ اسے طوافِ وداع کہتے ہیں۔ حج کے علاوہ اور دنوں میں عمرہ کے لیے جانے والے بھی خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔ بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ اس طواف کی کیا حکمت ہے؟ کیا یہ عمل ان لوگوں کے عمل کے مشابہ نہیں ہے جو اپنے بتوں کے گرد پھیرا لگاتے ہیں؟

حج کے بیش تر ارکان اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام، ان کی بیوی حضرت ہاجرہ اور بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی یادگار ہیں۔ احرام، تلبیہ (لبیک کہنا) حجر اسود کا استلام، صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا، قربانی، حلقِ راس، رمیِ جمار، ان تمام مراسمِ حج میں اس بابرکت خانوادے کے کسی نہ کسی عمل کی تمثیل پائی جاتی ہے۔ اسی طرح کی تمثیل طواف میں بھی موجود ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں شرک و بت پرستی عام تھی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے خانۂ کعبہ کی تاسیس کی، تاکہ توحید کا ایک مرکز قائم ہوا اور لوگ صرف اللہ واحد کی عبادت کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں دستور تھا کہ لوگ جس کو قربان کرنا چاہتے تھے اس سے معبد کے گرد پھیرے لگواتے تھے۔ خانۂ کعبہ کی تعمیر کرنے

---

[1] سنن ابن ماجہ، باب فضل العلماء

کے بعد حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اس کا طواف کیا۔ یہ گویا اس بات کی علامت تھی کہ انہوں نے اپنی زندگیوں کو صرف اللہ کے حوالے کر دیا ہے۔ حج اور دیگر مواقع پر خانۂ کعبہ کا طواف کرنے والے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے اسی عمل کو دہراتے ہیں اور انہی کی طرح اللہ کی کامل اطاعت اور اس کے سامنے خود سپردگی کا اعتراف کرتے ہیں۔

خانۂ کعبہ کا طواف درحقیقت اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کا ایک مخصوص طریقہ ہے۔ یہ عبادتِ الٰہی کا ٹھیک اسی طرح ایک مظہر ہے جس طرح اس کا ایک دوسرا مظہر نماز ہے۔ اسی لیے بعض احادیث میں طواف کو نماز سے تشبیہ دی گئی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الطواف حول البیت مثل الصلاۃ، الاّ انکم تتکلّمون فیہ، فمن تکلّم فیہ فلا یتکلّم الا بخیر[1]

خانۂ کعبہ کے گرد طواف نماز کے مثل ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ (نماز کے برخلاف) اس میں بولنے کی اجازت ہے۔ لہٰذا اگر کسی کو بولنا ہی ہو تو اچھی بات کہے۔

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی ﷺ دورانِ طواف قرآن میں مذکور یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنیَا حَسَنَةً وَّفِی الآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرۃ: ۲۰۰)

اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی۔ اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔

روایات میں حضرت عمرؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا بھی یہی عمل مذکور ہے۔ اسی لیے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ دورانِ طواف کثرت سے اللہ کا ذکر کرنا اور اس سے دعا مانگنا مستحب ہے[2]

---

[1] جامع ترمذی، ابواب الحج، باب بدون ترجمہ (باب نمبر ۱۱۲) یہ حدیث نسائی، دارمی اور احمد میں بھی ہے۔

[2] المغنی، ابن قدامہ، ۳/۳۷۸

خانۂ کعبہ کے گرد چکر لگانے کو ان لوگوں کے عمل کے مشابہ نہیں قرار دیا جا سکتا جو اپنے بتوں کے گرد پھیرا لگاتے ہیں، اس لیے کہ طوافِ کعبہ میں شرک کا شائبہ تک نہیں۔ خانۂ کعبہ کوئی بت یا اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ ایک مربع عمارت ہے جس کی تعمیر توحید کے ایک مرکز کی حیثیت سے کی گئی ہے۔ اور اس کا طواف کرنے والا گویا زبانِ حال سے یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ صرف اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور صرف اسی کی عبادت اور اطاعت کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔

قبلہ متعیّن کرنے کا مقصد:

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ نماز ادا کرتے وقت وہ اپنا رخ مسجدِ حرام (جس میں خانۂ کعبہ واقع ہے) کی طرف رکھیں:

وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَکُمْ شَطْرَهٗ (البقرۃ : ۱۴۴)

اب جہاں کہیں تم ہو، اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔

یہ حکم اتنا تاکیدی ہے کہ اس کی تعمیل پر کسی شخص کا مسلمان تسلیم کیا جانا موقوف ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من صلّی صلوتنا واستقبل قبلتنا وأکل ذبیحتنا فذٰلک المسلم .....الخ[۱]

جو شخص ہماری طرح نماز پڑھے۔ ہمارے قبلے کا رخ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے وہ مسلمان ہے۔

قبلہ رخ ہونا صحتِ نماز کی ایک شرط ہے۔ کوئی شخص جان بوجھ کر قبلہ کے علاوہ کسی دوسری طرف رخ کر کے نماز پڑھے تو اس کی نماز نہیں ہوگی [۲]

بعض حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ خانۂ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا کیوں ضروری قرار دیا گیا ہے؟ جب اللہ ہر جگہ اور ہر طرف ہے تو کسی بھی سمت رخ کر کے اس کی عبادت کی جا سکتی ہے۔ پھر مسلمانوں کو اپنی نمازوں میں ایک مخصوص سمت رخ کرنے کا کیوں پابند کیا گیا ہے؟

---

[۱] صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، باب فضل استقبال القبلۃ، عن انس ابن مالک

[۲] المغنی، ابن قدامہ، مکتبہ الریاض، ۱/۴۳۸

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم اجتماعیت قائم رکھنے کی خاطر دیا گیا ہے۔ تمام اسلامی عبادات میں اجتماعیت کی روح سموئی ہوئی ہے۔ نماز ہی کو لیجیے۔ فرض نمازوں کو اپنے اپنے گھروں میں پڑھ لینے کے بجائے ایک جگہ (مسجد میں) اکٹھا ہو کر ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اور حکم دیا گیا ہے کہ لوگ کسی ایک شخص کو اپنا امام منتخب کر لیں جو سب سے آگے کھڑا ہو اور سب لوگ اس کی اقتدا میں نماز ادا کریں۔ اسی اجتماعیت اور مرکزیت کے لیے ان کا قبلہ بھی متعین کر دیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ہر نماز کے وقت عجیب افراتفری کا عالم ہوتا۔ انفرادی نمازوں میں کسی کا رخ مغرب کی طرف ہوتا تو کسی کا مشرق کی طرف، کسی کا شمال کی طرف ہوتا تو کسی کا جنوب کی طرف۔ اور ہر نماز باجماعت کے موقع پر نمازیوں میں اختلاف رائے ہوتا کہ امام کس طرف رخ کر کے نماز پڑھائے۔ ایک قبلہ متعین کر کے ان سارے امکانات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا ہے۔

خانۂ کعبہ کو قبلہ کیوں بنایا گیا؟:

جب اجتماعیت کے پیشِ نظر نمازوں کے لیے کوئی ایک رخ متعین کرنا ضروری ٹھہرا تو اس کے لیے سب سے موزوں وہی رخ تھا جس پر خانۂ کعبہ واقع ہے۔ خانۂ کعبہ وہ پہلا معبد ہے جسے اللہ واحد کی عبادت کے لیے قائم کیا گیا تھا:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ (آل عمران-٩٦)

بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔

اس کی از سرِ نو تعمیر اللہ کے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی، جنہوں نے شرک و بت پرستی کے ماحول میں توحید کا علَم بلند کیا تھا۔ انہوں نے اس گھر کو توحید کی تعلیم و تبلیغ کا ایک مرکز بنانا چاہا تھا۔ اس لیے یہ حکم عین مناسب تھا کہ اللہ واحد کی عبادت کرنے والے اسی کو اپنا قبلہ بنائیں۔

پوری دنیا کے مسلمان جب خانۂ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں تو ان کے اندر اجتماعیت کا شدید احساس ابھرتا ہے۔ ان کو یاد دہانی ہوتی ہے کہ وہ ایک مشن

سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کا کام شرک و بت پرستی کا خاتمہ کرنا اور توحید کو عام کرنا ہے۔ جس طرح خانۂ کعبہ (جس کی طرف رخ کر کے وہ نماز ادا کر رہے ہیں) کے معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے انجام دیا تھا۔ خانۂ کعبہ کو قبلہ متعین نہ کیا جاتا تو یہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

اللہ ہر جگہ موجود ہے:

اگر مذکورہ بالا مقصد پیشِ نظر نہ ہوتا تو کسی سمت بھی رخ کر کے اللہ کی عبادت کی جا سکتی تھی۔ اللہ ہر جگہ موجود ہے۔ وہ کسی خاص سمت میں محدود نہیں ہے اور نہ اس کے نزدیک کسی سمت کو دوسری سمت پر برتری حاصل ہے۔ قرآن نے اس کا واضح الفاظ میں اعلان کیا ہے:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرة -۱۱۵)

مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ جس طرف بھی تم رخ کرو گے، اسی طرف اللہ کا رخ ہے۔

مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد اللہ کے رسول اور صحابہ ابتداء میں بیت المقدس (جو مدینہ سے شمال میں واقع ہے) کی جانب رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ بعد میں خانۂ کعبہ (جو مدینہ سے جنوب میں ہے) کو قبلہ بنانے کا حکم دیا گیا تو مسلمان اس طرف رخ کرنے لگے۔ اس تبدیلی کو اسلام کے مخالفوں نے فتنہ پھیلانے اور شبہات پیدا کرنے کا ذریعہ بنا لیا اور کہنے لگے کہ پہلے اپنی نمازوں میں بیت المقدس کی طرف کیوں رخ کرتے تھے؟ اور اب کیوں قبلہ تبدیل کر لیا؟ اس کا جواب دیا گیا کہ سمت کی تبدیلی بذاتِ خود کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تمام سمتیں اللہ کی ہیں:

سَيَقُوْلُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَاوَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِى كَانُوا عَلَيْهَا ،
قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (البقرة۔۱۴۲)

نادان لوگ ضرور کہیں گے: انہیں کیا ہوا کہ پہلے یہ جس قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اس سے یکا یک پھر گئے؟ اے نبی ان سے کہو: ”مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں“

مزید فرمایا گیا کہ جو لوگ رسول کی اتباع کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے سمتوں

کی تبدیلی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہیں جس سمت میں رخ کرنے کا حکم دیا جائے گا اور اللہ کی عبادت کا جو طریقہ بھی بتایا جائے گا، وہ بخوشی اس پر عمل کریں گے۔ دراصل گرانی ان لوگوں کو ہوتی ہے جو راہِ ہدایت سے بے بہرہ ہیں اور ان کے دل رسول کی اتباع پر آمادہ نہیں:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِی كُنْتَ عَلَيْهَا اِلاّ لِنَعْلَمَ مَن يَّتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ ، وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰه

(البقرۃ -۱۴۳)

پہلے جس طرف تم رخ کرتے تھے اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے۔ یہ معاملہ تھا تو بڑا سخت، مگر ان لوگوں کے لیے کچھ بھی سخت نہ ثابت ہوا جو اللہ کی ہدایت سے فیض یاب تھے۔

بعض صورتوں میں، مثلاً دورانِ سفر قطعیت کے ساتھ قبلہ کا رخ نہیں معلوم ہو پاتا۔ ایسی حالت میں حکم دیا گیا ہے کہ نمازی قبلہ کا اندازہ کر کے نماز پڑھ لے۔ اگر نماز پوری کر لینے کے بعد اسے قطعی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ قبلہ رخ نہیں تھا تو بھی نماز دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اگر وہ کسی ایسی سواری پر سوار ہو جس کا رخ بدلتا رہتا ہو تو نماز شروع کرتے وقت اندازہ کر کے قبلہ رُو ہو جائے، دورانِ نماز رخ تبدیل ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اس سے واضح ہوا کہ خانۂ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ایک مخصوص حکمت سے دیا گیا ہے، ورنہ کسی سمت کو کسی دوسری سمت پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

حجر اسود کی حقیقت

غیر مسلموں کی بت پرستی پر جب تنقید کی جاتی ہے اور انہیں سمجھایا جاتا ہے کہ انسان دنیا کی تمام مخلوقات میں سب سے اشرف ہے، اس لیے اس کے لیے روا نہیں کہ وہ مٹی پتھر کے بتوں کے آگے سر جھکائے اور پیشانی ٹیکے، تو ان میں سے بعض پلٹ کر کہتے ہیں: ''آپ لوگ بھی تو ایسا کرتے ہیں۔ آپ لوگ جب حج کرنے جاتے ہیں تو وہاں کعبہ میں لگے ہوئے کالے پتھر کے آگے سر جھکاتے اور اسے چومتے ہیں''۔ ان کی مراد حجرِ اسود سے ہوتی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حجرِ اسود کی حقیقت اور حج یا دوسرے مواقع پر طواف کے دوران اس کو بوسہ دینے کے حکم اور اس کی حکمت پر روشنی ڈالی جائے۔

حجرِ اسود کیا ہے؟:

کعبہ ایک تقریباً مربع عمارت ہے۔ اگر اس کی چاروں دیواروں کے مرکزوں سے عمودی خط کھینچے جائیں تو ان کی سمت شمال مشرق، شمال مغرب، جنوب مغرب اور جنوب مشرق ہوگی۔ شمالی کونا رُکنِ عراقی، مغربی کونا رُکنِ شامی، جنوبی کونا رُکنِ یمانی اور مشرقی کونا (حجرِ اسود کی مناسبت سے) رُکنِ اسود کہلاتا ہے[1]۔ مشرقی کونے میں فرش سے تقریباً پانچ فٹ بلندی پر دروازے کے قریب دیوار میں بیرونی جانب حجرِ اسود نصب ہے۔[2]

---

[1] دائرۃ المعارف الاسلامیہ، اردو دانش گاہ پنجاب، لاہور، ج/۱۷، ص: ۳۲۱_۱۲۲ مضمون ''کعبہ''

[2] حوالہ سابق، ص: ۳۲۳

اس پتھر کو نصب کیے جانے کا مقصد یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کے طواف کے آغاز و اختتام کے لیے وہ ایک نشان کا کام دے[1]۔ ہر طواف کو پورا کرنے کے بعد حاجی اس کو بوسہ دیتا ہے، یا سینے سے لگاتا ہے، یا ہاتھ، لکڑی یا کسی اور چیز سے اسے چھُو کر اس چیز کو چوم لیتا ہے، اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس کی طرف اشارے پر اکتفا کرتا ہے۔

تاریخ:

خانۂ کعبہ کی تعمیر آج سے تقریباً چار ہزار سال قبل اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر کی تھی۔ روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ دیوار میں پتھر چن رہے تھے اور حضرت اسماعیلؑ انہیں پتھر اٹھا اٹھا کر دیتے تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے فرمایا: بیٹے ایک ایسا پتھر لاؤ جسے میں لوگوں کے لیے بطورِ نشان لگا دوں۔ حضرت اسماعیلؑ ایک پتھر لے کر آئے، مگر وہ حضرت ابراہیمؑ کو پسند نہیں آیا۔ انہوں نے دوسرا پتھر لانے کو کہا۔ حضرت اسماعیلؑ ڈھونڈ کر ایک دوسرا پتھر لائے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے باپ اس جگہ ایک پتھر لگا چکے ہیں۔ انہوں نے دریافت کیا: ''ابا جان، یہ پتھر آپ کو کس نے لا کر دیا ہے؟'' انہوں نے جواب دیا: ''جس نے مجھے تمہارا احتاج نہیں بنایا ہے''۔ ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے جواب دیا ''جو تم سے زیادہ پھرتیلا ہے۔''

بعض روایتوں میں ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر بھیجے گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ حجرِ اسود کو بھی اتارا تھا، تا کہ وہ اس کے ساتھ مانوس رہیں۔ طوفانِ نوح کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اسے جبلِ ابو قبیس پر محفوظ رکھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ تعمیر کیا تو جبرئیل نے اسے لا کر اس کی جگہ پر نصب کر دیا[2]۔

حجرِ اسود کے بارے میں اور بھی بہت سے باتیں روایتوں میں ملتی ہیں، لیکن یہ تمام

---

[1] ابوالولید الازرقی، اخبار مکہ، مکتبہ خیاط، بیروت، ۱۹۶۴ء، ۱/۲۸_۲۹

[2] حجرِ اسود سے متعلق دیگر تاریخی روایتوں کے لیے دیکھیے ازرقی، اخبار مکۃ، حوالۂ سابق، تقی الدین الفاسی، شفاء الغرام باخبار البلد الحرام، مکتبہ النہضۃ الحدیثۃ، مکہ مکرمہ، ۱۹۵۶ء، ۱/۱۶۸_۱۷۱، طبری، تاریخ الرسل والملوک (تاریخ الطبری) دار المعارف مصر، ۱/۲۵۳، ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، دار الریان للتراث مصر، ۱۹۸۸ء، طبع اول، ۱/۱۵۵

روایتیں زیادہ قوی اور قابلِ استناد نہیں ہیں۔ بہر حال اس کے بارے میں یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ خانۂ کعبہ میں اسی وقت سے لگا ہوا ہے جب سے حضرت ابراہیمؑ نے اس کی تعمیر کی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی زندگی پر ایک نظر:

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے ایک برگزیدہ پیغمبر تھے۔ ان کی پوری زندگی شرک اور بت پرستی کے خلاف جدو جہد میں گزری۔ انہوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اس میں بے شمار بتوں کی پرستش کی جاتی تھی۔ ان کی فطرتِ سلیم نے رہنمائی کی کہ کائنات اور انسانوں کی تخلیق کرنے والی ایک ہستی ہے اور وہی عبادت کی مستحق ہے۔ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد انہوں نے اپنے باپ اور قوم کو توحید کی دعوت دی اور بتوں کی پوجا کرنے اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے سے روکا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ ستارے، چاند اور سورج خدا نہیں ہیں، بلکہ یہ تو خدائے واحد کے حکموں کے پابند ہیں۔ یہ مٹی پتھر کے بت کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ ان کی ان باتوں پر باپ نے بھی جھڑکیاں دیں اور قوم بھی ایمان نہ لائی، بلکہ الٹے ان کی جان کی دشمن بن گئی۔ بالآخر جب وہ اس کی جانب سے مایوس ہو گئے تو دوسرے علاقوں میں توحید کا پیغام عام کرنے کے لیے ہجرت کی۔ وہ جہاں بھی تشریف لے گئے لوگوں کو ایک اللہ کی طرف بلایا اور انہیں شرک اور بت پرستی سے روکا۔ آخر میں انہوں نے ایک ایسا مرکزِ عبادت قائم کرنے کا ارادہ کیا جو رہتی دنیا تک کے لیے توحید کا نشان قرار پائے، وہاں ہر جگہ سے لوگ صرف اللہ کے نام پر اکٹھا ہوں اور صرف اسی کی عبادت کریں۔ انہوں نے اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر خانۂ کعبہ کی تعمیر کی، پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیے کہ بارِ الٰہا، ہم نے یہ گھر صرف تیری عبادت کے لیے بنایا ہے۔ تو ہم دونوں کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنائیو اور ہم سے ایک ایسی نسل اٹھائیو جو صرف تیرے سامنے سر جھکاتی اور تیری اطاعت کرتی ہو۔[1]

---

[1] حضرت ابراہیمؑ کے احوالِ زندگی کا تذکرہ قصص الانبیاء، قصص القرآن اور تاریخِ عام کی کتابوں میں بھی ملتا ہے اور مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ اردو زبان میں دیکھیے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، قصص القرآن، ندوۃ المصنفین دہلی، جلد اول، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، سیرت سرور عالم، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی جلد اول

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس خدمت اور دعا کو قرآن نے محفوظ کر دیا ہے:

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمَاعِیْلُ، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ. رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ. (البقرۃ: ۱۲۷۔۱۲۸)

اور یاد کرو، ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے: اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے۔ تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرماں) بنا۔ ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو۔

حجرِ اسود حضرت ابراہیمؑ کی توحید پرستی کی یاد دلاتا ہے:

خانۂ کعبہ کی تعمیر کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں میں اس کی زیارت کرنے اور وہاں پہنچ کر مراسمِ عبودیت انجام دینے کا اعلانِ عام کر دیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے خود ان مراسم پر عمل کیا اور اپنے متبعین کو بھی ان کی تعلیم دی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعلانِ عام کو اتنی برکت دی کہ اس وقت سے آج تک ہر سال بے شمار لوگ دنیا کے ہر خطے سے حج کے لیے پہنچتے ہیں، اور سب ایک ساتھ اکٹھا ہو کر اللہ کی کبریائی کا اعلان کرتے ہیں۔ حج میں انجام دیے جانے والے مناسک حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ورثہ ہیں۔ ایک حدیث میں اس حقیقت کا اظہار یوں کیا گیا ہے۔ حضرت ابن مربع انصاریؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قفوا علی مشاعرکم فانکم علی ارث من ارث ابراھیم [1]

اپنے مناسکِ حج سے واقفیت حاصل کرو اس لیے کہ تم ابراہیم علیہ السلام کے ورثہ کے مالک ہو

حجرِ اسود کی تاریخ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وابستہ ہے۔ اسے بوسہ دے کر اس سے عقیدت کا جو اظہار کیا جاتا ہے وہ درحقیقت حضرت ابراہیمؑ سے غایت درجہ محبت اور دل میں ان کی عظمت کا مظہر ہے۔ حجرِ اسود ان کی یاد دلاتا ہے اور ان کی شخصیت کے نمایاں ترین وصف ”توحید پرستی“ کی یاد دہانی کراتا ہے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب المناسک، باب موضع الوقوف بعرفۃ، ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی الوقوف بعرفات۔

حجرِ اسود اللہ کے شعائر میں سے ہے:

اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ حجرِ اسود اللہ کے شعائر میں سے ہے۔ ''شعائر شعیرۃ کی جمع ہے، جس کے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جو کسی حقیقت کا احساس دلانے والی اور اس کا مظہر اور نشان (SYMBOL) ہو۔ اصطلاحِ دین میں اس سے مراد شریعت کے وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کسی معنوی حقیقت کا شعور پیدا کرنے کے لیے بطور ایک نشان اور علامت کے مقرر کیے گیے ہوں۔ ان مظاہر میں مقصود بالذات تو وہ حقائق ہوا کرتے ہیں جو ان کے اندر مضمر ہوتے ہیں، لیکن یہ مقرر کیے ہوئے اللہ اور رسول کے ہوتے ہیں، اس وجہ سے ان حقائق کے تعلق سے یہ مظاہر بھی تقدیس کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں''[۱]

حجرِ اسود کس پہلو سے ''شعائرِ اللہ'' میں سے ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ ” نے اس کی بڑی اچھی تشریح کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''حجر اسود ایک شعیرہ ہے۔ یہ پتھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے اس روایت کا ایک نشان ہے کہ اس کو بوسہ دے کر یا اس کو ہاتھ لگا کر بندہ اپنے رب کے ساتھ اپنے عہدِ بندگی اور اپنے میثاقِ اطاعت کی تجدید کرتا ہے۔ چناں چہ بعض حدیثوں میں اس کو ''یمین اللہ'' (خدا کا ہاتھ) سے تعبیر کیا گیا ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ جب اس کو ہاتھ لگاتا ہے تو گویا وہ خدا کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر اس سے تجدیدِ بیعت کرتا ہے اور جب اس کو بوسہ دیتا ہے تو گویا یہ اس کی طرف سے خدا کے ساتھ عہدِ محبت و وفاداری کا اظہار ہوتا ہے''[۲]

رسول اللہ ﷺ کا عمل:

احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ حرم میں داخل ہوتے تو پہلے طواف فرماتے۔

---

[۱] امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۷۶ء، طبع سوم، ۳۴۰/۱

[۲] حوالہ سابق

آپ طواف کا آغاز رکنِ اسود سے کرتے تھے[۱] ہر طواف میں جب آپ حجرِ اسود کے پاس آتے تو اس کو بوسہ دیتے، یا اس پر ہاتھ رکھتے، پھر ہاتھ کو بوسہ دیتے، یا اگر کسی سواری پر طواف کر رہے ہوتے اور ہاتھ میں کوئی چھڑی ہوتی تو اس سے حجرِ اسود کو چھوتے اور پھر اس چھڑی کو بوسہ دیتے۔ [۲] جب بھی آپ حجرِ اسود کے پاس آتے "اللہ اکبر" کہتے تھے[۳] حجرِ اسود اور رکنِ یمانی کے درمیان آپؐ سے یہ دعا بھی منقول ہے:

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔[۴]

اے ہمارے رب، ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ حجرِ اسود کو بوسہ دیتے، اسے چھوتے یا اس کی طرف اشارہ کرتے وقت اللہ کی کبریائی کا اعلان کرتے اور اسی سے دعائیں مانگتے تھے۔

حضرت عمرؓ کا حکیمانہ قول:

رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں یہ عمل مسنون ٹھہرا۔ صحابہ کرام دورانِ طواف حجرِ اسود کو ہاتھ سے چھوتے تھے، پھر ہاتھ کو بوسہ دیتے تھے[۵] حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ایک مرتبہ دورانِ طواف حجرِ اسود کو بوسہ دیا، پھر اس خیال سے کہ کہیں لوگوں کو یہ دھوکا نہ ہو کہ اس میں الٰہی شان ہے، اس کے سامنے کھڑے ہو کر فرمایا:

انّي أعلم أنک حجر لاتضرّ ولاتنفع، ولولاأنّي رأيت النبي ﷺ يقبّلک ما قبّلتک[۶]

میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع۔ اگر میں نے نبی ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو میں بھی تجھے بوسہ نہ دیتا۔

---

[۱] بخاری، کتاب الحج، باب استلام الحجر الاسود

[۲] زاد المعاد، ابن القیم الجوزیہ، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، طبع پنجم، ۱۹۸۷ء، ۲/۲۲۵۔۲۲۶

[۳] بخاری، کتاب الحج، باب التکبیر عند الرکن، زاد المعاد، ۳/۲۲۶

[۴] مسند احمد، ۳/۴۱۱، مصنف عبدالرزاق، کتاب الحج، باب الذکر فی الطواف، ۵/۵۰۔۵۱، حدیث نمبر ۸۹۶۳

[۵] فتح الباری، ابن حجر العسقلانی، دار المعرفۃ بیروت، ۳/۴۷۳

[۶] بخاری، کتاب الحج، باب ماذکر فی الحجر الاسود

حضرت عمرؓ کا یہ اشارہ بہت اہم اور حکیمانہ ہے۔ اس سے حجر اسود کے بارے میں صحیح اسلامی تصور کی ترجمانی ہوتی ہے۔ طبری نے اس کی تشریح میں لکھا ہے:

’’حضرت عمرؓ نے یہ بات اس لیے فرمائی، کیوں کہ لوگوں نے ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے بتوں کی پرستش چھوڑی تھی۔ انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں بعض جاہل لوگ یہ نہ گمان کر لیں کہ حجر اسود کو چھونا اسی طرح کا عمل ہے جیسا کہ عرب جاہلیت میں کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے بتایا کہ حجر اسود کو ہاتھ سے چھونے اور ہاتھ کو بوسہ دینے کا مقصد اللہ عزّ وجل کی تعظیم اور اس کے نبی ﷺ کے حکم کی تعمیل ہے۔ یہ حج کے شعائر میں سے ہے، جن کی تعظیم کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ یہ عمل عہدِ جاہلیت میں عربوں کی بت پرستی کے عمل سے مختلف ہے، اس لیے کہ ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہوتا تھا کہ یہ بت اللہ سے تقرب کا ذریعہ ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس عقیدہ کی مخالفت کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ صرف وہی ذات عبادت کی مستحق ہے جو نقصان اور نفع پہنچانے پر قادر ہو اور وہ ذات اللہ عزّ وجل کی ہے‘‘[1]

تعظیم میں حد سے گزرنا جائز نہیں:

معلوم ہوا کہ حجر اسود کو بوسہ دینے کی وجہ یہ نہیں کہ اس میں فی نفسہ تعظیم و تقدیس کا کوئی پہلو پایا جاتا ہے، بلکہ یہ اس فطری محبت کا نتیجہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی نسل اور ان کی روحانی اولاد کو ان سے ہے۔ اور اس لیے بھی کیوں کہ حجر اسود اللہ کے شعائر میں سے ہے اور شعائر کی تعظیم خود اللہ کی تعظیم کے مرادف ہے، لیکن اس سلسلے میں ایک چیز ملحوظ رکھنی ضروری ہے اور وہ یہ کہ شعائر کی تعظیم کا جو طریقہ بتایا گیا ہے اور اس کے جو حدود مقرر کیے گئے ہیں، ان سے ذرا سا بھی تجاوز نہ کیا جائے۔ اس معاملے میں بے احتیاطی گمراہی تک پہنچا سکتی ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں:

’’جس طرح شعائر اللہ کے مقرر کردہ ہیں اسی طرح اسلام میں ان شعائر کی تعظیم کے حدود بھی خدا اور رسول ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ جس شعیرہ کی جو شکل شریعت میں ٹھہرا دی گئی ہے، وہی اس حقیقت کے اظہار کی واحد شکل ہے جو اس شعیرہ کے اندر مضمر ہے۔

---

[1] عمدۃ القاری، بدر الدین عینی، مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ، مصر، ۱۹۷۲ء، ۸۳/۸، فتح الباری، ۴۶۳/۳

اس سے سرمو انحراف نہ صرف اس شعیرہ کی حقیقت سے انسان کو محروم کر دینے والی بات ہے، بلکہ اس سے شرک و بدعت کے دروازے بھی کھل سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ حجر اسود ایک شعیرہ ہے۔ اس کی تعظیم کے لیے اس کو حالتِ طواف میں بوسہ دینے، یا اس کو ہاتھ لگا کر ہاتھ چوم لینے یا اس کی طرف اشارہ کرنے کی شکلیں خود دین کے لانے والے کی طرف سے مقرر کر دی گئی ہیں۔ اگر کوئی شخص تعظیم کی صرف انہی شکلوں پر قناعت نہ کرے، بلکہ تعظیمِ شعائر اللہ کے جوش میں وہ اس پتھر کے آگے گھٹنے ٹیکنے لگے، یا اس کے سامنے نذریں پیش کرنے لگے، یا اس پر پھول نثار کرنے لگے، یا اس طرح کی کوئی اور حرکت کرنے لگے تو ان باتوں سے وہ نہ صرف یہ کہ اس حقیقت سے بالکل دور ہو جائے گا جو اس شعیرہ کے اندر مضمر ہے، بلکہ وہ شرک و بدعت میں بھی مبتلا ہو جائے گا''[۱]

بوسہ دینا ضروری نہیں:

یہاں ایک بات یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ مناسکِ حج و عمرہ میں طواف کے دوران حجر اسود کو بوسہ دینا ضروری نہیں، کہ اس کے لیے ہوڑ لگائی جائے، دھینگا مشتی کی جائے اور بھیڑ کو ڈھکیلتے ہوئے اس کی کوشش کی جائے، بلکہ ''اس کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ طواف کرنے والے کے لیے اگر ممکن ہو تو اس کو بوسہ دے، یہ ممکن نہ ہو تو ہاتھ سے اس کو چھو کر ہاتھ کو چوم لے، یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرے۔''[۲]

اللہ کے رسول ﷺ سے یہ سارے طریقے ثابت ہیں۔ آپؐ نے حجر اسود کو بوسہ بھی دیا ہے، اسے ہاتھ سے چھو کر ہاتھ کو بوسہ دیا ہے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے سوار ہو کر طواف کیا۔ آپؐ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ آپؐ نے اس چھڑی سے حجر اسود کو چھوا اور پھر چھڑی کو بوسہ دیا۔ اسی طرح بعض اوقات آپ نے اس کی طرف صرف اشارہ کرنے پر بھی اکتفا کیا ہے۔[۳]

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر بن الخطابؓ سے فرمایا:

''اے ابو حفص، تم طاقت ور آدمی ہو۔ اس لیے کمزور کو تکلیف پہنچا کر حجر اسود کو

---

[۱] تدبر قرآن، ۳۴۱/۱

[۲] فتح الباری، ۴۷۳/۳

[۳] زاد المعاد، ۲۲۶_۲۲۵/۲

بوسہ دینے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر رکن (حجر اسود کے مقام) کو خالی پاؤ تو بوسہ دو، ورنہ اللہ أکبر کہہ کر آگے بڑھ جاؤ"[1]

بعد میں یہی ہدایت حضرت عمرؓ دوسرے لوگوں کو دیا کرتے تھے۔ [2]

یہ تفصیل یہ وضاحت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مسلمانوں کا حجر اسود کو بوسہ دینے کا عمل اس عمل سے قطعی مختلف ہے جو بت پرست اپنے مٹی پتھر کے بتوں کے سامنے انجام دیتے ہیں۔

☆☆☆

---

[1] رزین، بحوالہ نقوشِ رسول نمبر، لاہور، ۴۰۶/۶

[2] حوالہ سابق

کیا حج دولت کا ضیاع ہے؟

حج اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ مال دار مسلمانوں پر حج بیت اللہ فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران: ۹۷)
>
> لوگوں پر یہ اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ اس کا حج کرے۔

خانۂ کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہونے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا دے (البقرة: ۱۲۸) اللہ تعالیٰ نے آپ کو مناسکِ حج بتائے اور یہ بھی حکم دیا کہ لوگوں میں حج کا اعلانِ عام کر دیں:

> وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ (الحج: ۲۷)
>
> اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں۔

اس اعلانِ عام کی تاثیر کا ہی نتیجہ ہے کہ اس وقت سے آج تک ہر زمانے میں بے شمار لوگ دنیا کے کونے کونے سے کھنچ کر حج کے لیے پہنچتے رہے ہیں اور دن بدن ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ حجاج کی رہائش اور دیگر سہولیات کے لیے بڑے پیمانے پر معیاری انتظامات کیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی روز افزوں تعداد کو دیکھتے ہوئے ان میں مزید بہتری اور اضافہ کی

ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حج کے موقع پر پوری دنیا سے لاکھوں مسلمانوں کے اکٹھا ہونے سے انتظامات پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے، جس کی بنا پر مختلف نوعیت کے حادثات ہوتے رہتے ہیں اور سیکڑوں لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ سفر کی دشواریاں اس پر مستزاد ہیں۔ جب ہر جگہ حسبِ سہولت اللہ کی عبادت کی جاسکتی ہے تو دوٗر دراز مقامات سے سفر کی مشقتیں جھیل کر اور خاصی رقم خرچ کر کے حج کے لیے مکہ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ اربوں کھربوں روپیہ جو ہر سال حج پر خرچ ہوتا ہے، اس سے انفرادی یا اجتماعی طور پر فلاح و بہبود کے دوسرے بہت سے کام لیے جاسکتے ہیں۔

اس تجویز کا محرک یہ نہیں ہے کہ اسے پیش کرنے والوں کو انسانی فلاح و بہبود کے کاموں سے غیر معمولی دلچسپی ہے اور اس کے لیے دیگر ذرائع سے خاطر خواہ سرمایہ فراہم نہ ہو پانے کی وجہ سے ان کے ذہنوں میں بس یہی ایک تجویز آسکی ہے۔ اگر انھیں رفاہی کاموں سے واقعی دلچسپی ہوتی تو یہ حضرات ان نجی و سرکاری تقریبات کی مخالفت کرتے جن میں محض نام و نمود کے لیے بے تحاشا دولت خرچ کی جاتی ہے، ان مالی اسکینڈلوں کے خلاف تحریک چلاتے جن کے ذریعہ قوم کی دولت ہڑپ کی جاتی ہے، اور اس طرح ان صاحبِ ثروت لوگوں اور قوم کے رہنماؤں کو رفاہی کاموں کی انجام دہی کی طرف متوجہ کرتے۔

حج کے فائدے:

اس اعتراض کا سبب یہ ہے کہ یہ حضرات حج کی حقیقت اور اس کی حکمتوں سے ناواقف ہیں۔ حج اپنے اندر غیر معمولی فائدے رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حج کا اعلانِ عام کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے:

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (الحج:۲۷)

تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں۔

اس آیت میں 'منافع' نکرہ آیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ وغیرہ فرماتے

ہیں کہ اس سے دنیوی اور اخروی دونوں طرح کے فائدے مراد ہیں [۱]۔ امام طبریؒ اس کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ”ان لوگوں کا قول زیادہ قرینِ صواب معلوم ہوتا ہے جو اس سے دنیوی اور اخروی، دونوں طرح کے فائدے مراد لیتے ہیں۔ متعین فائدے بیان نہ کرنے کا مقصد بھی یہی ہے، تاکہ اس میں وہ تمام فائدے شامل ہوں جو حج سے حاصل ہوتے ہیں“ [۲]

امام زمخشریؒ اور امام رازیؒ فرماتے ہیں:

نکر ”منافع“ لأنه أراد منافع مختصة بهذه العبادة دينية و دنيوية لا توجد في غيرها من العبادات [۳]

منافع کو نکرہ لایا گیا ہے، اس لیے کہ اس سے وہ تمام دینی و دنیاوی فائدے مراد ہیں جو صرف اسی عبادت کے ساتھ خاص ہیں اور وہ دیگر عبادتوں سے نہیں حاصل ہوتے ہیں۔

یہ فائدے اس شخص کو بھی حاصل ہوتے ہیں جو حج کے لیے نکلتا اور مراسمِ حج انجام دیتا ہے اور دنیا کے تمام مسلمان بھی انہیں محسوس کرتے ہیں۔ ان اہم فوائد کو دیکھتے ہوئے حج پر آنے والا صرف نہ کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتا۔

حج سے حاصل ہونے والے چند اہم فائدے درج ذیل ہیں:

الف: جذبۂ عبودیت کی آبیاری:

حج کا سب سے بڑا فائدہ حاجی کو یہ حاصل ہوتا ہے کہ اس کا جذبۂ عبودیت انتہائی راسخ اور قوی ہو جاتا ہے۔ وہ محض اللہ کے لیے اپنا گھربار، رشتہ دار اور کاروبار چھوڑ کر نکل کھڑا ہوتا ہے اور سفر کی زحمتیں برداشت کرتا ہے۔ اس کا یہ سفر عام سفروں جیسا نہیں ہوتا، بلکہ اس میں وہ زیادہ تر ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتا ہے۔ ایک متعین مقام پر (جسے میقات کہتے ہیں) پہنچ کر وہ ”احرام“ باندھتا ہے۔ یہ احرام حقیقت میں دو چادریں ہیں جن میں ایک کو تہبند کی طرح باندھ لیتا اور دوسری کو اوڑھ لیتا ہے۔ اب اس کے لیے زیب و زینت

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، ۲۱۶/۳

[۲] تفسیر طبری، ۹۹/۷

[۳] کشاف، ۱۱/۳، تفسیر کبیر، ۱۸۰/۶

کی تمام چیزیں ممنوع ہوجاتی ہیں۔ وہ سلے ہوئے کپڑے پہن سکتا ہے نہ خوشبو لگا سکتا ہے، نہ بال بنوا سکتا اور ناخون ترشوا سکتا ہے، نہ شکار کر سکتا ہے۔ غرض اس کی ہیئت اس شخص جیسی ہوجاتی ہے جو کسی کی محبت میں اس حد تک فنا ہو کہ اسے اپنے حال کی خبر نہ ہو۔ احرام باندھتے ہی اس کی زبان پر خود سپردگی اور تعمیلِ ارشاد کے یہ کلمات (جنھیں تلبیہ کہتے ہیں) جاری ہوجاتے ہیں:

> لَبَّيْکَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْکَ، لَبَّيْکَ لَا شَرِيْکَ لَکَ لَبَّيْکَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ، لَا شَرِيْکَ لَکَ۔[1]
>
> حاضر ہوں، اے اللہ، حاضر ہوں، حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، یقیناً حمد صرف تیرے لیے ہے، نعمت تیری ہی عطا کی ہوئی ہے، بادشاہت صرف تیری ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔

اللہ واحد کے لیے اخلاص، خود سپردگی، تعظیم اور شکر گذاری کے یہ کلمات اس کی زبان پر ہر وقت جاری رہتے ہیں۔ سونے جا رہا ہو یا بیدار ہوا ہو، بلندی پر چڑھ رہا ہو یا نشیب میں اتر رہا ہو، نماز سے فارغ ہو رہا ہو یا کسی قافلے سے مل رہا ہو۔ ہر موقع پر اس کی زبان انھی کلمات کا ورد کرتی ہے۔ خانۂ کعبہ پر نظر پڑتی ہے تو الله أكبر، لا اله الاالله کہہ کر اللہ کی کبریائی اور وحدانیت کا اعلان کرنے لگتا ہے۔ حرم میں جا کر کعبہ کا طواف کر کے اللہ سے اپنی انتہائی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ ایام حج شروع ہوتے ہیں تو اس کی ہر لمحے کی مصروفیات اسی طرح انجام پانے لگتی ہیں جس طرح اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے۔ جس وقت کوچ کرنے کو کہا گیا ہے اسی وقت روانہ ہوجاتا ہے۔ جہاں ٹھہرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں ٹھہر جاتا ہے۔ جہاں ذکر واستغفار کی تلقین کی گئی ہے وہاں ذکر واستغفار میں مصروف ہوجاتا ہے۔ غرض، ان ایام کا ایک ایک لمحہ وہ اللہ کی یاد میں گزارتا ہے۔ اپنے گناہوں اور نافرمانیوں پر توبہ واستغفار کرتا ہے اور اس کی بندگی کا عہد کرتا ہے۔ اس طرح چند ایام اس روح پرور ماحول میں گزار کر اس کا باطن ہر طرح کی آلائشوں سے پاک و صاف ہوجاتا ہے اور وہ اپنے دل میں پختہ عزم لے کر لوٹتا ہے کہ آئندہ زندگی بھی اسی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناسک، باب التلبیۃ

طرح اللہ کی مرضی کے مطابق گزارے گا۔ اسی حکمت کی طرف درج ذیل حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے:

من حجّ هذا البيت فلم يرفث ولم يفسق رجع كيوم ولدته أمّه[1]

جس شخص نے اس گھر کا حج کیا اور اس دوران نہ کوئی شہوانی حرکت کی، نہ کسی معصیت کا ارتکاب کیا تو جب وہ لوٹتا ہے تو ایسا ہوتا ہے گویا آج ہی پیدا ہوا ہے۔

ب: تاریخی اور روحانی ماحول کا مشاہدہ:

حج کا دوسرا فائدہ حاجی کو یہ حاصل ہوتا ہے کہ سرزمینِ حجاز میں پہنچ کر وہاں کے احوال و آثار کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اسی جگہ آج سے کئی ہزار سال قبل اللہ کے ایک بندے (حضرت ابراہیم علیہ السلام) نے اپنی اولاد کو لا بسایا تھا اور اللہ واحد کی عبادت کے لیے ایک مرکز قائم کیا تھا۔ اس وقت یہ جگہ بے آب و گیاہ اور ویران تھی اور اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ یہاں آبادی ہونے لگی۔ اس کی دعوتِ توحید کا علم بلند کرنے والے ملتے گئے، یہاں تک کہ حج کے لیے اس کے اعلانِ عام کے جواب میں آج لاکھوں افراد ہر سال اکٹھا ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح حاجی اس سرزمین میں اسلام کی ابتدائی تاریخ کے آثار کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہیں سے آخری رسول حضرت محمد ﷺ نے ملتِ ابراہیمی کے مجدّد کی حیثیت سے اپنی دعوت کا آغاز کیا تھا۔ یہیں آپ پر ایمان لانے والوں نے بے مثال قربانیاں دیں اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا۔ اس کا دل ان جاں نثاروں کی عقیدت سے بھر جاتا ہے اور اسے اس سرزمین کے چپے چپے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ان آثار کو دیکھ کر اس کے اندر بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے، اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں اپنی جان لگا دینے اور اس پر مر مٹنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

ج: اتحاد اور مساوات کا بے مثال مظاہرہ:

حج میں دنیا کے مختلف ملکوں سے مسلمان آتے ہیں۔ وہ مختلف قومیتوں اور مختلف

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناسک، باب فضائل الحج المبرور

نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ کوئی کالا ہے تو کوئی گورا، کوئی امیر ہے تو کوئی غریب، کوئی جاہ ومنصب کا مالک ہے تو کوئی اس سے محروم۔ لیکن دوران حج یہ سارے اختلافات اور امتیازات مٹ جاتے ہیں۔ سب کے بدن پر ایک ہی طرح کا لباس ہوتا ہے۔ سب کی زبانوں پر ایک ہی صدا ہوتی ہے۔ سب ایک امام کے پیچھے صف بستہ ہوکر نماز ادا کرتے ہیں۔ کہیں جانا ہوتا ہے تو ایک ساتھ جاتے ہیں۔ کہیں ٹھہرنا ہوتا ہے تو ایک ساتھ ٹھہرتے ہیں اور واپس آنا ہوتا ہے تو ایک ساتھ واپس آتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

اَلْمَسجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنَاہُ لِلنَّاسِ سَوَاءً العَاكِفُ فِیْهِ والبَادِ. (الحج: ۲۵)

مسجد حرام جسے ہم نے سب لوگوں کے لیے بنایا ہے، جس میں مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر ہیں۔

قریش کے لوگ خادمانِ حرم ہونے کی وجہ سے خود کو عام اہلِ عرب سے برتر تصور کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے لیے یہ شانِ امتیاز قائم کر لی تھی کہ مزدلفہ ہی سے پلٹ آتے تھے، جب کہ عام اہل عرب عرفات تک جاتے تھے۔ قرآن نے ان کی چودھراہٹ ختم کی اور انہیں حکم دیا کہ جہاں تک سب لوگ جاتے ہیں، وہاں تک تم بھی جاؤ اور سب لوگوں کے ساتھ وہاں سے پلٹو۔ [۱]

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ (البقرۃ: ۱۹۹)

پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو۔

اس طرح حج سے مساوات کا ایک بے مثال مظاہرہ ہوتا ہے اور پوری دنیا کے مسلمان خود کو ایک خاندان کے افراد محسوس کرتے ہیں۔

د: عظیم الشان اجتماعیت:

حج کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں میں اجتماعیت کی روح پیدا ہوتی اور اس کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ اجتماعیت کی روح یوں تو اسلام کی دیگر عبادتوں میں بھی پائی

---

[۱] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب ثم افیضوا من حیث افاض الناس، تفسیر ابن کثیر، ۲۴۲/۱

جاتی ہے، لیکن اس کا سب سے بڑا اور نمایاں اظہار حج میں ہوتا ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے لاکھوں مسلمان ایک جگہ اکٹھا ہوتے ہیں۔ ان کی نسلیں، قومیتیں، زبان اور رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن سب ایک ساتھ مل کر مناسکِ حج ادا کرتے ہیں۔ ایک ساتھ خانۂ کعبہ کا طواف، صفا و مروہ کی سعی، منی اور مزدلفہ میں قیام، رمی جمرات اور قربانی کرتے ہیں۔ حج کا سب سے اہم رکن میدان عرفات کی حاضری ہے۔ یہاں حج کے لیے آنے والے تمام مسلمان اکٹھا ہوتے ہیں۔ جو شخص اس اجتماع میں حاضر نہ ہو سکے اس کا حج ہی معتبر نہ ہوگا۔ غرض چند ایام کی اس اجتماعیت سے انہیں یہ تربیت ملتی ہے کہ انہیں اپنی زندگی اجتماعیت کے ساتھ گزارنی چاہیے۔

حج کی ایک حیثیت سالانہ عالمی اجتماع کی ہے۔ اس میں دنیا کے کونے کونے سے مسلمان شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح حاجیوں کو دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے ملاقات کرنے، ان سے تعلقات استوار کرنے، ان کے حالات اور مسائل سے واقف ہونے اور باہم مشترک معاملات پر غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے۔

یہ فائدے صرف حج ہی سے حاصل ہوتے ہیں:

جن فوائد کا اوپر تذکرہ کیا گیا، وہ اپنی اعلیٰ ترین شکل میں صرف حج ہی سے حال ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض فوائد کسی حد تک دیگر اسلامی عبادات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً نماز ذکرِ الٰہی سے عبارت ہے۔ اس کی باجماعت ادائیگی سے مساوات، اتحاد اور اجتماعیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کے ذریعہ راہِ خدا میں مال خرچ کر کے اس کا تزکیہ ہوتا ہے اور غریب اور ضرورت مند مسلمانوں کی حاجت روائی اور خبر گیری ہوتی ہے۔ روزہ کے ذریعہ بعض مرغوباتِ نفس پر پابندی عائد کر کے نفس کی خواہشات پر کنٹرول کرنے کی مشق ہوتی ہے۔ حج ان تمام فوائد کا جامع ہے۔ اس میں قدم قدم پر ذکرِ الٰہی ہے۔ اس سے بہت بڑے پیمانے پر مساوات، اتحاد و اتفاق اور اجتماعیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی ادائیگی مصارفِ سفر برداشت کر کے اور مال خرچ کر کے ہوتی ہے۔ اور اس میں مرغوباتِ نفس پر پابندیاں روزہ سے بڑھ کر ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ حج کے لیے انفرادی طور پر ہر حاجی کو خاصے مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں اور سفر کی صعوبتیں اٹھانی پڑتی ہیں اور اجتماعی طور پر بھی بڑے پیمانے پر انتظامات کرنے پڑتے ہیں اور مختلف نوعیت کے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن مذکورہ فوائد کو دیکھتے ہوئے یہ دشواریاں ہیچ ہیں اور یہ مصارف کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔

متبرک مقامات کی زیارت ہر قوم میں مشروع ہے:

اس اعتراض سے بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں کسی ایک جگہ اکٹھا ہونا صرف مسلمانوں کی خصوصیت ہے۔ دیگر مذاہب کے ماننے والوں نے انتظامات کی دشواریوں اور گراں بار مصارف کو دیکھتے ہوئے اپنے یہاں مذہبی اجتماعات کو پسند نہیں کیا ہے اور انفرادی طور سے اپنے اپنے مقام پر عبادت کر لینے کو ترجیح دی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم کے کچھ مقدس مقامات، آستانے، زیارت گاہیں اور تیرتھ استھان ہیں جو بعض تاریخی اور مذہبی واقعات کی وجہ سے متبرک سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں لوگ مخصوص مواقع پر بڑی تعداد میں اکٹھا ہوتے ہیں اور اپنے مذہب کے مطابق مراسمِ عبادت انجام دیتے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالی اپنے رسول کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

لِکُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَکاً هُمْ نَاسِکُوْہ فَلاَ یُنَازِعُنَّکَ فِیْ الْاَمْرِ وَادْعُ
اِلیٰ رَبِّکَ اِنَّکَ لَعَلٰی هُدیً مُسْتَقِیْم (الحج:٦٧)

ہر امت کے لیے ہم نے ایک طریقِ عبادت مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے۔
پس اے نبی وہ اس معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں۔ تم اپنے رب کی طرف دعوت دو۔
یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہودیوں کے یہاں عیدالحصاد (Harvest Festival) عیدالفصح (Easter) اور عید المظال (Feast Of Tabernacles) کے موقع پر بیت المقدس میں حاضری بہت ہی اہم تصور کی جاتی ہے اور وہاں ہیکلِ سلیمانی اور بعض پیغمبروں کے مزارات پر مخصوص مذہبی رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ کرسمس کے موقع پر عیسائیوں کا بہت بڑا اجتماع بیت اللحم میں ہوتا ہے جہاں حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی سے متعلق مقامات کو دیکھنے میں دلچسپی لی جاتی ہے۔ روم (Rome) میں سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کی قبروں کو اہم زیارت گاہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے جہاں رومن کیتھولک عیسائی بہت بڑی تعداد میں اکٹھا ہوتے ہیں۔

جہاں تک ہندوستانی مذاہب مثلاً ہندومت، جین مت، بودھ مت وغیرہ کا سوال ہے، ان کے متبرک مقامات، زیارت گاہوں، مندروں اور استھانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان مقامات پر ہونے والے میلوں، عرسوں اور اشنان میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لوگ اکٹھا ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض میلے ہر سال لگتے ہیں اور بعض کئی سال کے بعد۔ کمبھ کا میلہ بارہ سال کے بعد لگتا ہے۔ اس موقع پر لاکھوں زائرین پریاگ میں اکٹھا ہوتے ہیں۔

اسلام میں پیغمبروں کے مقبروں کو جائے عبادت بنا لینے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے یہود اور نصاریٰ کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی ہے جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا تھا[۱]۔ آپؐ نے اہتمام اور ثواب کی نیت کے ساتھ صرف تین مسجدوں (مسجدِ حرام، مسجدِ نبوی، اور مسجدِ اقصیٰ) کی زیارت کے لیے سفر کی اجازت دی ہے [۲]۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے مقابلے میں دیگر مذاہب کے ماننے والے زیادہ مواقع پر اپنے مذہبی مقامات اور تیرتھ استھانوں میں اکٹھا ہوتے ہیں۔ وہ دوردراز سے خطیر مصارف برداشت کرکے وہاں حاضری دیتے ہیں۔ ان کے لیے حکومتی اور سماجی اداروں کو بہت بڑے پیمانے پر انتظامات کرنے پڑتے ہیں اور جمِ غفیر کے اکٹھا ہوجانے سے مختلف نوعیت کے حادثات بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ان اجتماعات کی افادیت پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا۔ حالاں کہ جو اعتراض حج کے موقع پر مسلمانوں کے اکٹھا ہونے پر کیا جاتا ہے، وہ دیگر مذاہب کے ان اجتماعات پر بدرجۂ اولیٰ عائد ہوتا ہے۔

☆☆☆

---

[۱] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ ودیگر مقامات، صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب فضل بناء المسجد

[۲] صحیح بخاری، کتاب فضل الصلوۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ، باب فضل الصلوۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ، صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل الصلوۃ بمسجدی مکۃ والمدینۃ

قربانی اور اس کی اہمیت

حج سے جڑی ہوئی ایک عبادت قربانی کی ہے۔ اس کا شمار مناسکِ حج میں ہوتا ہے۔ حج کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ . (الحج: ۲۸)

تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں اور چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں۔

اس کے علاوہ جو لوگ ”حج تمتع“ یا ”حج قِران“[1] کرنا چاہیں یا کسی رکاوٹ کے سبب حج پورا نہ کرسکیں، یا کسی مرض یا تکلیف کی بنا پر قیودِ احرام توڑنے پر مجبور ہوجائیں، یا حالتِ احرام میں ممنوع کوئی فعل (مثلاً شکار) ان سے سرزد ہوجائے تو ان صورتوں میں بھی بطورِ فدیہ قربانی کرنے کا حکم دیا گیا ہے (البقرۃ: ۱۹۶، المائدۃ: ۹۵)

حج کے علاوہ بھی قربانی مسنون ہے۔ عید الاضحیٰ کے دن نمازِ عید کے بعد آپؐ نے خود بھی قربانی کی ہے اور ذی استطاعت مسلمانوں کو بھی قربانی کرنے کا حکم دیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] ”حج تمتع“ یہ ہے کہ آدمی حج کے مہینوں میں عمرہ کی نیت کرے، عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد احرام کھول دے پھر حج کے دنوں میں دوبارہ احرام باندھ کر حج کرے۔ ”حج قِران“ کا مطلب یہ ہے کہ احرام اس نیت سے باندھا جائے کہ عمرہ اور حج دونوں ایک ساتھ ادا کیے جائیں گے۔ پہلے عمرہ ادا کیا جائے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد حالتِ احرام ہی میں رہا جائے اور حج ادا کرکے احرام کھولا جائے۔ حج کی ان دونوں صورتوں میں قربانی واجب ہے۔ ایک تیسری صورت حجِ افراد کی ہے۔ یعنی احرام باندھتے وقت صرف حج کی نیت کی جائے، عمرہ نہ کیا جائے۔ اس صورت میں قربانی واجب نہیں ہے۔

مَنْ كَانَ لَهُ سَعَةٌ فَلَمْ يُضَحِّ فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا۔[1]

جو شخص قربانی کی استطاعت رکھتا ہو پھر بھی قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے۔

کیا قربانی ایک مسرفانہ رسم ہے؟:

بعض حضرات کو قربانی پر اعتراض ہے۔ وہ اسے ایک لایعنی اور مسرفانہ رسم قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس عمل میں جہاں ایک طرف سنگ دلی اور بے رحمی کا پہلو نمایاں ہے[2] تو دوسری طرف بے شمار جانوروں کا ضیاع ہے۔ حج کے موقع پر بہت بڑی تعداد میں جانور ذبح کیے جاتے ہیں اور ان کا گوشت صحیح مصرف میں نہ آنے کی بنا پر ضائع ہو جاتا ہے۔ حج کے علاوہ بھی ہر سال پوری دنیا کے لاکھوں کروڑوں مسلمان قربانی کرتے ہیں۔ اس طرح کروڑوں روپیہ بے مصرف چلا جاتا ہے۔ ان معترضین کے خیال میں اس خطیر رقم کو انفرادی یا اجتماعی طور پر رفاہی کاموں میں خرچ کیا جائے تو اس سے بے شمار فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔[3]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدمتِ خلق اور فلاحِ عام کے سارے کام قربانی کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں۔ اس پر پابندی عائد ہوتے ہی یہ سارے کام ہونے لگیں گے۔ حالاں کہ سوچنے کا یہ انداز صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے انفاق کا جذبہ بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک کسی کے دل میں دوسرے انسانوں سے ہمدردی، غم خواری اور ان کے دکھ درد میں کام آنے کا جذبہ نہ ہو، وہ اپنی کمائی ہوئی دولت ان پر خرچ نہیں کر سکتا۔

قربانی کی متعدد حکمتیں اور اس کے دینی، اخلاقی اور معاشی فائدے ہیں۔ وہ پیشِ نظر رہیں تو اس قسم کے اعتراضات نہیں اٹھیں گے۔

---

[1] سنن ابن ماجہ، کتاب الاضاحی، باب الأضاحی واجبۃ ھی أم لا؟

[2] قربانی پر اعتراض کرنے والوں کا اصل اعتراض یہ ہے کہ جانوروں کا ذبیحہ ''جیو ہتیا'' یعنی جاندار کا قتل ہے۔ یہ عمل سنگ دلی کا مظہر ہے۔ اس اعتراض کا آگے الگ سے جائزہ لیا جائے گا۔

[3] اس قسم کے اعتراضات سے بچنے کے لیے بعض ''مسلم دانش وروں'' نے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ اسلام میں جانوروں کی قربانی کا حکم دیا ہی نہیں گیا ہے۔ ان خیالات کے رد کے لیے ملاحظہ کیجیے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے مضامین ''قربانی پر منکرینِ حدیث کا حملہ'' ''تحقیق قربانی پر تنقید'' اور ''قربانی کی شرعی حیثیت'' در کتاب ''تفہیمات'' شائع شدہ: مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، حصہ دوم، ص: ۲۲۸-۲۶۲

نذر و نیاز اور قربانی انسانی فطرت ہے:

انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ جس ہستی یا ہستیوں کو اپنا کارساز اور حاجت روا سمجھتا ہے، ان کے سامنے عاجزی و فروتنی اختیار کرتا، مراسمِ عبودیت بجالاتا اور نذر و نیاز اور قربانی پیش کرتا ہے۔ چناں چہ دنیا کی تمام قومیں اپنے معبودوں پر چڑھاوے چڑھاتی اور ان کے سامنے قربانیاں کرتی رہی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض قوموں میں انسانی قربانی کا بھی رواج رہا ہے۔ اسلام نے جہاں عبادت کی تمام شکلوں کو غیر اللہ کے لیے ممنوع قرار دے کر صرف اللہ کے لیے خاص کر دیا وہیں اس نے جانوروں کو بھی صرف اللہ کے نام پر قربان کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكاً لِيَذْكُرُوْا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَارَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ

(الحج: ۳۴)

ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے، تاکہ (اس امت کے) لوگ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ (ان مختلف طریقوں کے اندر مقصد ایک ہی ہے) پس تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے اور اسی کے تم مطیع فرمان بنو۔ اور اے نبی، بشارت دے دو عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو۔

قربانی کے جانوروں کو قرآن "شعائر اللہ" قرار دیتا ہے۔ یعنی وہ اللہ کی عظمت و کبریائی کی ایک علامت ہوتے ہیں اور ان سے یہ اظہار ہوتا ہے کہ انہیں محض اللہ کے نام پر قربان کرنے کے لیے خاص کر دیا گیا ہے:

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ، لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوْا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَاقَّ (الحج: ۳۶)

اور (قربانی کے) اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے۔ تمہارے لیے ان میں بھلائی ہے۔ پس انہیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو۔

آگے قرآن یہ بھی واضح کرتا ہے کہ قربانی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اللہ کو جانوروں

کے گوشت اور خون کی کوئی حاجت ہے، بلکہ وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کے بندوں کے دلوں میں اس کے احکام پر عمل کرنے اور اس کی اطاعت و فرماں برداری کا کتنا جذبہ پیدا ہوا ہے:

> لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ. كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰاكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ. (الحج:۳۷)
>
> نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون، مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس نے ان کو تمہارے لیے اس طرح مسخر کیا ہے تاکہ اس کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اس کی تکبیر کرو۔ اور اے نبی، بشارت دے دو نیکوکار لوگوں کو۔

قربانی اللہ کی نعمتوں پر شکر گزاری کا اظہار ہے:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختلف نعمتوں سے نوازا ہے اور کائنات کی مختلف اشیاء کو اس کی خدمت اور فائدے کے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ مثلاً وہ اللہ کے عطا کیے ہوئے مال و دولت سے اسبابِ زندگی فراہم کرتا ہے، زمین سے اگنے والی نباتات، پھلوں اور غلّوں کو اپنی غذا بناتا ہے، جانوروں سے بار برداری اور دوسرے کام لیتا ہے اور ان کا گوشت بھی کھاتا ہے۔ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کا تقاضا ہے کہ انسان ان چیزوں کا کچھ حصہ اس کی راہ میں خرچ کرتا رہے اور اس کے حضور نذر و نیاز میں پیش کرتا رہے، تاکہ اسے یاد دہانی ہوتی رہے کہ وہ ان چیزوں کا مالک نہیں ہے، بلکہ وہ خالق کائنات کی جانب سے اسے عطا کی گئی ہیں، اس لیے اس پر لازم ہے کہ ان کے استعمال اور تصرف میں ہمیشہ عطا کرنے والے کی مرضی کو پیش نظر رکھے۔ اسی مصلحت سے مال میں زکوٰۃ اور پیداوار میں عُشر فرض کیا گیا اور یہی قربانی کی بھی حکمت ہے۔ قربانی کے اونٹوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (الحج:۳۶)

> اور جب (قربانی کے بعد) ان کی پیٹھیں زمین پر ٹک جائیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور ان کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں اور ان کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔ ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمہارے لیے مسخر کیا ہے تا کہ تم شکریہ ادا کرو۔

سورۂ بقرہ میں کھانے پینے کی حرام چیزوں کے تذکرہ سے قبل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُلُوْا مِنَ طَيِّبَاتِ مَارَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۔ (البقرة: ۱۷۲)
>
> اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔

حضرت ابراہیمؑ کے تاریخی واقعہ کی یادگار:

قربانی کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ اللہ کے برگزیدہ پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تاریخی واقعہ کی یاد دلاتی ہے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اس خواب کو اشارۂ الٰہی سمجھ کر اس کی تعمیل میں وہ حقیقت میں اسے قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس لیے کہ ان کے دل میں اللہ کی محبت ہر محبت پر غالب تھی۔ انہوں نے محبوبِ حقیقی کے ڈھکے چھپے اشارہ کی تاویل کر لینا گوارا نہ کیا۔ بالآخر جب انہوں نے اپنے لختِ جگر کو ذبح کرنے کے ارادے سے ماتھے کے بل پچھاڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں خواب کو سچ کر دکھانے اور آزمائش میں کامیاب ہو جانے کا مژدہ سنایا۔ اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کی محض آزمائش کرنا چاہتا تھا، بیٹے کو ذبح کروانا مقصود نہ تھا۔ چناں چہ جب وہ اس آزمائش میں کامیاب ہو گئے تو انہیں بیٹے کا خون بہانے سے روک دیا اور ایک بڑی قربانی کو اس کا فدیہ بنا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس عظیم الشان واقعہ کی یادگار کے طور پر قیامت تک کے لیے یہ سنت جاری کر دی کہ تمام صاحبِ حیثیت مسلمان ہر سال جانوروں کی قربانی کریں۔ اس عمل سے انہیں یہ یاد دہانی ہوتی ہے کہ اللہ کی محبت، وفاداری، جاں نثاری اور قربانی کا ویسا ہی جذبہ مطلوب ہے جیسا حضرت ابراہیمؑ کے دل میں پایا جاتا تھا۔

قربانی کا معاشی پہلو:

کہا جاتا ہے کہ قربانی مال کا ضیاع ہے۔ ہر سال کروڑوں روپیہ جانوروں کی قربانی پر صرف ہو جاتا ہے۔ اس روپیہ کو اگر رفاہی کاموں میں خرچ کیا جائے تو بہت سے بے روز گاروں کو روز گار سے لگایا جا سکتا ہے، بہت سی بیواؤں اور یتیموں کی کفالت کی جا سکتی ہے، بہت سے غریبوں اور ناداروں کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں اور فلاحِ عام کے دیگر بہت سے کام کیے جا سکتے ہیں۔

یہ بات محض ایک مغالطہ ہے۔ قربانی کی مذکور بالا حکمتیں اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں اور وہی اس کی ضرورت و معنویت ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ معاشی حیثیت سے بھی قربانی کے بہت سے فائدے ہیں اور اسے کسی بھی صورت میں مال کا ضیاع قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ مثلاً:

۱۔ قربانی کا گوشت تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا۔ قرآن کہتا ہے:

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوْا الْبَائِسَ الْفَقِيْر (الحج: ۲۸)

خود بھی کھاؤ اور تنگ دست محتاج کو بھی کھلاؤ۔

دوسری جگہ ہے:

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوْا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ (الحج: ۳۶)

تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور ان کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں، اور ان کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔

قربانی کے گوشت سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اٹھائیں۔ اس مقصد سے ابتدائے اسلام میں، جب صحابہؓ تنگی کا شکار تھے، آں حضرت ﷺ نے تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت استعمال کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس حکم کا منشا یہ تھا کہ قربانی کرنے والے اپنے پاس گوشت ذخیرہ نہ کر لیں، بلکہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیں۔ لیکن بعد میں جب تنگی دور ہو گئی تو آپ نے یہ پابندی اٹھا لی۔ حضرت بُریدہؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ لُحُوْمِ الأَضَاحِيْ فَوْقَ ثَلاثٍ لِيَتَّسِعَ ذَوُوْالطَّوْلِ عَلٰى مَنْ لا طَوْل لَهٗ . فَكُلُوْا مَا بَدالَكُمْ، وَاَطْعِمُوْاوَادَّخِرُوْا[1]

میں نے تم لوگوں کو قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ رکھنے سے منع کیا تھا، تاکہ صاحبِ حیثیت لوگ ضرورت مندوں کے معاملے میں کشادہ دستی سے کام لیں۔ اب جب تک چاہو، اسے کھاؤ اور دوسروں کو کھلاؤ اور جتنا چاہو ذخیرہ کرو۔

آں حضرت ﷺ کا معمول تھا کہ قربانی کا گوشت تین حصوں میں تقسیم کرتے تھے: ایک حصہ گھر والوں کے لیے رکھ لیتے تھے، ایک حصہ پڑوس کے ضرورت مندوں کو دیتے اور ایک حصہ مساکین اور مانگنے والوں میں تقسیم فرماتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی مروی ہے کہ وہ ایک حصہ خود کھاتے تھے، دوسرا حصہ فقراء و مساکین میں صدقہ کرتے تھے اور ایک حصہ رشتہ داروں اور اہلِ تعلق کو ہدیہ بھیجتے تھے۔ صحابۂ کرام میں سے کسی سے اس کے خلاف منقول نہیں ہے۔ اس لیے اس پر ایک حیثیت سے اجماع ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ قربانی کا گوشت جتنا زیادہ سے زیادہ صدقہ کردیا جائے، بہتر ہے۔ اس لیے کہ آں حضرت ﷺ کے بارے میں مروی ہے کہ آپؐ نے حج کے موقع پر سو (۱۰۰) اونٹوں کی قربانی کی اور چند بوٹیاں اپنے کھانے کے لیے نکال کر بقیہ سارا گوشت صدقہ کردیا۔[2]

دنیا میں کروڑوں انسان ایسے ہیں جو خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کرتے ہیں، جنھیں مہینوں کوئی اچھی قوت بخش غذا نصیب نہیں ہوتی۔ قربانی سے انھیں کچھ اوقات کے لیے گوشت کھانے کو مل جاتا ہے۔

۲۔ قربانی کرنے والے کے لیے قربانی کی کھال بیچ کر اس کی رقم اپنے کام میں لانا جائز نہیں ہے۔ وہ چاہے تو کھال کو ذاتی استعمال میں لے آئے، یا کسی غریب کو دے دے۔ بعض فقہاء مثلاً امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ اور اسحاقؒ وغیرہ کی رائے ہے کہ وہ اسے بیچ کر

---

[1] جامع ترمذی، ابواب الاضاحی، باب ماجاء فی الرخصۃ فی أکلھا بعد ثلاث۔ اس مفہوم کی حدیث صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، سنن ابوداؤد، کتاب الاشربۃ اور کتاب الجنائز اور سنن نسائی، کتاب الاضاحی میں بھی موجود ہے۔

[2] المغنی، ابن قدامہ، ۶۳۲/۸

اس کی رقم صدقہ کرسکتا ہے۔[1]

اس طرح قربانی کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں غریبوں کو قربانی کی کھالیں یا ان کی رقمیں مل جاتی ہیں اور وہ ان سے اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

۳۔ ہزاروں قصاب اس موقع پر قربانی کے جانوروں کو ذبح کرنے کی اجرت پاتے ہیں۔ اجرت میں گوشت یا کھال دینا جائز نہیں ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں آپؐ کے جانوروں کی قربانی کے وقت نگرانی کروں، ان کی کھالوں اور جھول کو صدقہ کردوں اور قصاب کو ان میں سے کوئی چیز نہ دوں[2] ہاں، اس کے فقر کی وجہ سے یا بطورِ ہدیہ گوشت، کھال یا کوئی دوسری چیز اسے دی جاسکتی ہے، بلکہ دینا چاہیے۔[3]

۴۔ قربانی سے ان لاکھوں گلہ بانوں کا بھی فائدہ ہوتا ہے جو سال بھر جانوروں کو پالتے ہیں اور عیدالاضحیٰ کے موقع پر انہیں اچھی قیمتوں میں فروخت کرتے ہیں۔ سال کے عام دنوں میں جانوروں کی جو قیمتیں ہوتی ہیں، عیدالاضحیٰ کے دنوں میں ان میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس طرح ایک مخصوص زمانے میں جانوروں کو فروخت کرنے سے گلہ بان فائدہ میں رہتے ہیں۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ قربانی کے، معاشی پہلو سے بھی بہت سے فائدے ہیں۔

قربانی کا گوشت محفوظ رکھنے کی تدابیر:

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حج کے موقع پر چند دنوں میں اتنے زیادہ جانور قربان کردیئے جاتے ہیں کہ بہت زیادہ مقدار میں گوشت ضائع ہوجاتا ہے اور وہ استعمال کے قابل نہیں رہتا۔ وہ تجویز کرتے ہیں کہ ایک متعین تعداد سے زیادہ جانوروں کی قربانی کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔

یہ تدبیر کا مسئلہ ہے۔ قربانی پر پابندی عائد کرنے یا اسے محدود کرنے کا مشورہ

---

[1] المغنی، ابن قدامہ، ۸/۶۳۴_۶۳۵

[2] صحیح بخاری، کتاب الاضاحی، باب لایعطی الجزار من الھدی شیئا، صحیح مسلم

[3] المغنی، ۸/۶۳۴

دینے کے بجائے ان تدابیر پر غور کرنا چاہیے جن سے قربانی کے گوشت کو ضائع ہونے سے بچایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف جدید وسائل وذرائع کام میں لائے جاسکتے ہیں، مثلاً کولڈ اسٹوریج کی سہولتیں فراہم کی جائیں، تاکہ ضرورت سے زائد گوشت کو محفوظ رکھا جاسکے اور سال کے بقیہ دنوں میں فقراء ومساکین اسے استعمال کرسکیں، یا گوشت منجمد کرکے اور اسے ڈبوں میں بند کرکے دوسرے ممالک میں بھیجا جائے جہاں ضرورت مند اسے استعمال کریں۔ سعودی حکومت اس سلسلے میں بعض تدابیر پر عمل کرتی ہے۔ اس طرح کی مزید تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔

☆☆☆

پردہ کی حقیقت ☆

اسلامی نظامِ معاشرت کے جن پہلوؤں پر سب سے زیادہ اعتراضات کیے گئے ہیں ان میں سے ایک پردہ ہے۔ اس پر اعتراضات کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ عورت کی آزادی پر شب خوں مارنے کے مترادف ہے۔ عورت کا حسن و جمال فطرت کی صناعی کا اعلیٰ شاہ کار ہے۔ اس سے لطف اندوز ہونے کا ہر ایک کو حق دینا چاہیے۔ اسے چھپا کر رکھنا بے ذوقی کی دلیل ہے۔ پردہ صدیوں پرانے اس قدیم عہد کی یادگار ہے جب عورت کو لونڈی کی حیثیت دی جاتی تھی اور اسے گھر میں قید کر کے رکھا جاتا تھا۔ اب جب کہ نئی روشنی کے نتیجے میں عورت کو اس کا جائز مقام مل گیا ہے اور وہ مرد کے دوش بدوش زندگی کے تمام میدانوں میں سرگرمیاں انجام دے رہی ہے اس قدیم رسم سے چمٹے رہنا دانش مندی نہیں ہے۔

ان اعتراضات کا جواب بہت سے مسلمان معذرت خواہانہ انداز میں دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پردہ زوال پذیر مسلم معاشرہ کی ایجاد ہے۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اس کا وجود تھا۔ قرآن میں پردہ کا حکم صرف آں حضرت ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے لیے تھا، اس لیے کہ انہیں معاشرہ میں خاص مقام حاصل تھا۔ عام مسلمان عورتوں کے لیے کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ معترضین کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہتے ہیں کہ پردہ تو اصلاً دل کا پردہ ہے۔ اگر دل میں فساد ہو تو ہزاروں پردوں میں رہ کر عورت غلط راستہ اختیار کر سکتی ہے، اگر باطن درست ہو تو بے حجابی سے عورت کا کچھ نہیں بگڑتا۔

☆ ''اسلامی پردہ۔ کیا اور کیوں؟'' کے عنوان سے راقم کا ایک کتابچہ دفتر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ پٹنہ سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا ہے۔ یہاں اس کی تلخیص دی جا رہی ہے۔

درحقیقت یہ دونوں قسم کے لوگ پردہ کی حقیقت سے ناواقف ہیں اور اسلامی نظامِ معاشرت میں اس کی ضرورت واہمیت کا انہیں شعور نہیں۔

پردہ اسلامی نظامِ معاشرت کا ایک حصّہ ہے۔ اس کی حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے اسلام کے معاشرتی نظام کو ایک کل کی حیثیت سے سمجھنا ہوگا۔ اس سے الگ کرکے پردہ کی ضرورت واہمیت کا صحیح فہم حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ کسی نظام کے ساتھ یہ بہت بڑی زیادتی ہوگی کہ اس کے حصے بخرے کردیے جائیں اور تمام اجزاء کو ایک دوسرے سے الگ کرکے اس کے کسی ایک جزء کا مطالعہ اپنے خودساختہ پیمانوں کے ذریعے کیا جائے۔ وہ شخص گلاب کے حسن کا کیوں کر اندازہ کرسکتا ہے جو اس کی تمام پنکھڑیوں کو الگ کردے، پھر اس کی کوئی ایک پنکھڑی اٹھا کر اس کے مطالعہ میں منہمک ہوجائے۔ گلاب کا حقیقی حسن اسی وقت تک ہے جب تک اس کی تمام پنکھڑیاں جڑی ہوئی ہوں اور وہ ایک خوشنما پھول کی شکل میں موجود ہو۔ اسی طرح پردہ کی حقیقت صحیح طریقے پر اسی وقت سمجھی جاسکتی ہے جب اسلام کا پورا معاشرتی نظام نگاہوں کے سامنے ہو اور اس نظام میں پردہ کا صحیح محلِ وقوع معلوم ہو۔

اسلامی نظامِ معاشرت:

کسی بھی سماج کی بہتری مرد وعورت کے درمیان صحیح تعلق میں پوشیدہ ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس معاملے میں مختلف سماج بے اعتدالی کا شکار رہے ہیں۔ چنانچہ کبھی تفریط سے رہبانیت نے جنم لیا ہے تو افراط سے بے حیائی اور عریانیت کو فروغ ملا ہے۔ یہی معاملہ ان کے حقوق وفرائض کا بھی ہے۔ کبھی تو عورت کے انسانی حقوق تک کا انکار کردیا گیا تو کبھی اسے ہر معاملے میں مرد کے دوش بدوش لاکھڑا کردیا گیا۔ اسلامی نظامِ معاشرت ایسی تمام بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔

اسلام نے مرد وعورت کے حقوق اور فرائض میں توازن رکھا ہے۔ وہ نہ تو جنسی جذبہ کو دبانے اور کچلنے کا قائل ہے اور نہ اس کی تسکین کے لیے انسان کو بے مہار چھوڑ دیتا ہے۔ بلکہ اس نے اس کے لیے اسے نکاح کا پابند کیا ہے اور صنفی خواہش کی تسکین کے دیگر

تمام طریقے حرام قرار دیے ہیں، خواہ ان کا ارتکاب سماج کی نگاہوں کے سامنے کیا جائے یا پوشیدہ رہ کر، اور ان میں طرفین کی مرضی شامل ہو یا نہ ہو۔ اسلام نے عورت کو مرد کے مساوی حیثیت دی ہے اور اسے تمام مذہبی، معاشرتی اور تمدنی حقوق سے بہرہ ور کیا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک ''مساوات'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ سارے کام جو مرد انجام دیتا ہے، عورت بھی انجام دے، بلکہ اس نے دونوں کے درمیان کاموں کو تقسیم کر دیا ہے۔ اس نے مرد کے ذمے گھر سے باہر کا کام رکھا ہے اور عورت کے ذمے گھر کے اندر کا کام۔ بچوں کی پرورش و پرداخت اور نئی نسل کی تربیت کا کام عورت سے متعلق ہے۔ اس کی انہی اندرونِ خانہ مصروفیات کو دیکھتے ہوئے بیرونِ خانہ ذمہ داریاں اس سے ساقط کر دی گئی ہیں۔ مثلاً پنج وقتہ نمازوں کی ادائیگی کے لیے مسجد میں جانے سے اسے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے اور گھر میں اس کے نماز پڑھنے کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح جنازہ میں شرکت سے اسے روک دیا گیا ہے۔ خاندان کی شکل میں جو اجتماعیت قائم ہوتی ہے اس کی سربراہی مرد کو سونپی گئی ہے۔ اسی ذمہ داری کی بنا پر مرد کو اہل وعیال کے نفقہ کا ذمہ دار بنایا گیا ہے، جب کہ عورت پر گھر کا خرچ چلانے کا کوئی بار نہیں رکھا گیا ہے۔

تطہیرِ معاشرہ کی تدابیر:

معاشرہ کو پاک صاف رکھنے کے لیے اسلام نے متعدد تدابیر اختیار کی ہیں۔ وہ معاشرہ کے ہر فرد کے دل میں اللہ کا خوف پیدا کرتا ہے۔ وہ مرد اور عورت دونوں کو جسم کے وہ تمام حصے چھپانے کا حکم دیتا ہے جن میں ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش پائی جاتی ہے۔ وہ اس معاملے میں اتنا حساس ہے کہ آدمی کا تنہائی میں بھی برہنہ رہنا پسند نہیں کرتا۔ اس کی تعلیم ہے کہ معاشرہ کے افراد جہاں تک ممکن ہو، غیر شادی شدہ نہ رہیں، تاکہ وہ جنسی تسکین کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرنے پر مجبور نہ ہوں۔ اسی طرح وہ جائز حدود میں جنسی تسکین کے لیے پرمسرّت اور بھرپور ازدواجی زندگی کی تلقین کرتا ہے۔ وہ شوہر اور بیوی دونوں کو حکم دیتا ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات اور خواہشات کا خیال رکھیں۔

اسلام معاشرہ کو اس حد تک پاک صاف رکھنا چاہتا ہے کہ وہ یہ بھی پسند نہیں کرتا

کہ برے خیالات لوگوں کی زبانوں پر آئیں اور ان کی اشاعت ہو۔ وہ اس معاملے میں اتنا حساس ہے کہ وہ اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ بیوی اپنے شوہر کے سامنے کسی دوسری عورت کی صنفی خصوصیات بیان کرے، یا شوہر دوسروں کے سامنے اپنی بیوی کے محاسن آشکارا کرے۔ جو لوگ معاشرہ میں آوارگی پھیلانے اور اس کی شقافیت کو گدلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے لیے اسلام دردناک سزا تجویز کرتا ہے۔ زنا اس کے نزدیک بدترین جرم ہے اور اس کی سزا سو کوڑے یا رجم ہے۔ ایک شریف عورت کی عصمت اس کے نزدیک اتنی محترم ہے کہ اگر کوئی شخص اس پر زنا کی جھوٹی تہمت لگادے تو اسے اسّی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں گے۔

پردہ کے حدود:

مذکورہ بالا تدابیر کے علاوہ اسلام نے کچھ ایسے احکام بھی دیے ہیں جو سماج میں مردوں اور عورتوں کے دائروں کو الگ الگ کرکے صنفی انتشار کے امکانات کو محدود کردیتے ہیں اور ایک ایسا ماحول پیدا کرنے میں معاونت کرتے ہیں جس میں صنفی میلانات کو برانگیختہ کرنے والی تحریکات نہ پائی جاتی ہوں۔ ان احکام کو ''پردہ'' کا جامع عنوان دیا جاسکتا ہے۔

اس سلسلے میں اسلام مردوں اور عورتوں دونوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور نظر کے فتنے سے محفوظ رہیں۔ دوسروں کے گھروں میں داخل ہونے سے پہلے اجازت لے لیا کریں۔ اسلام کسی بھی موقع پر نامحرم کے ساتھ تنہائی میں رہنے سے سختی سے منع کرتا ہے۔ اس لیے کہ ایسے حالات میں جب صنفِ مخالف کے دو افراد یکجا ہوں، ان کے درمیان کوئی تیسرا نہ ہو اور کوئی حجاب بھی نہ ہو تو اس کا عین امکان ہے کہ وہ شیطان کے بہکاوے میں آجائیں اور صنفی جذبات کا ریلا انہیں بہا لے جائے۔ اسی طرح اسلام نہ کسی محفل میں مردوں اور عورتوں کا گھل مل کر رہنا پسند کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے موقع پر ان کے خلط ملط رہنے کا روادار ہے۔

اسلام نے لباس کے سلسلے میں جو احکام دیے ہیں ان کا مقصد بھی ستر پوشی کے

ساتھ صنفی ہیجانات وتحریکات کی تحدید ہے۔ اس نے عورتوں کے لیے کوئی مخصوص لباس لازم نہیں کیا ہے، بلکہ اس کی کچھ شرائط بیان کردی ہیں۔ جس لباس میں بھی وہ شرائط پائی جائیں گی اس کے پہننے مین کوئی مضایقہ نہیں۔ مثلاً وہ ستر ڈھانکنے والا ہو، اتنا باریک نہ ہو کہ اس سے بدن جھلکے، اس لیے کہ اس صورت میں ستر پوشی نہیں ہوسکتی، بلکہ اس سے عورت کے محاسن میں اوراضافہ ہوگا، خوشبو میں بسا ہوا نہ ہو، اس لیے کہ خوشبو بھی جذبات کومتحرک کرنے کا سبب بنتی ہے، ڈھیلا ڈھالا ہو، اتنا چست نہ ہو کہ عورت کے جسمانی نشیب وفراز نمایاں ہوجائیں، مردوں کے لباس کے مشابہ نہ ہو۔

اسلام عورت کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ بن سنور کر غیر مردوں کو دعوتِ نظارہ دیتی پھرے، بلکہ وہ اسے اپنی زینت کو چھپانے اور اپنے محاسن کو آشکارا نہ کرنے کا حکم دیتا ہے (صرف قریبی رشتہ داروں کے سامنے اسے اپنی زینت کے اظہار کی اجازت دی گئی ہے، اس لیے کہ ان میں عموماً صنفی جذبات کے بجائے احترام، محبت اور شفقت کے جذبات پائے جاتے ہیں)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَايُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (النور – ۳۱)

اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں، بجز اس کے جو خود ظاہر ہوجائے۔

اس آیت میں ''اِلَّا مَا ظَهَرَ'' سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں صحابہ، تابعین اور بعد کے علماء میں بھی اختلاف رہا ہے۔ بعض حضرات اس سے مراد بیرونی کپڑے لیتے ہیں کہ انھیں چھپانا ممکن نہیں۔ بعض حضرات ہاتھ اور ان کے اسبابِ زینت مثلاً چوڑیاں، کنگن اور انگوٹھیاں مراد لیتے ہیں کہ وہ پردہ میں داخل نہیں، اور بعض حضرات کے نزدیک اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں، جو پردہ سے مستثنیٰ ہیں۔

پردہ پر اعتراضات:

اسلامی نظامِ معاشرت کی خصوصیات، اس میں عورت کی حیثیت اور اس کے دائرہ کار سے ناواقفیت کی وجہ سے 'پردہ' پر بہت سے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔

سطورِ ذیل میں ان میں سے چند کا تذکرہ کر کے ان کا مختصراً جائزہ لیا جائے گا۔

۱۔ آزادی سے محرومی:

اس سلسلہ میں ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ عورت کو پردہ کا پابند بنانے سے اس کی آزادی سلب ہوتی ہے، جو ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ مرد کی طرح عورت بھی انسانی وجود رکھتی ہے۔ اس پر کچھ زائد پابندیاں عائد کر دینے سے اس کی انسانیت کی توہین و تذلیل ہوتی ہے۔

اسلام نے عورت کے لیے لازم کیا ہے کہ وہ مردوں کے سامنے ایک خاص وضع اور خاص لباس میں آئے۔ یہ حکم بعض معاشرتی مصالح کی بنیاد پر دیا گیا ہے، تاکہ لوگوں کے اخلاق پراگندہ نہ ہوں اور معاشرہ میں صنفی انتشار پیدا نہ ہو۔ اسے آزادی یا بنیادی انسانی حقوق پر قدغن نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تمام متمدن معاشروں میں رہن سہن کے خاص طریقوں کی پابندی کی جاتی ہے۔ مثلاً کسی کو اجازت نہیں ہوتی کہ وہ برہنہ ہو کر گھر سے باہر نکلے، یا سونے کا لباس پہن کر کام پر جائے، مگر اس پابندی کو فرد کی آزادی یا بنیادی انسانی حق کے خلاف قرار نہیں دیا جاتا۔

اسلام چاہتا ہے کہ عورت گھر سے باہر نکلے تو اپنے لباس، چال ڈھال اور گفتگو میں وہ طرز اختیار کرے جس سے کسی کے جذبات برانگیختہ نہ ہوں۔ وہ آرائش و زیبائش کے ذریعے لوگوں کی شہوت آمیز نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کرے۔ اس طرح اسلام اسے ساتر لباس کا پابند بنا کر معاشرہ کے افراد کی نگاہوں میں عزت و احترام کا مقام عطا کرتا ہے۔

۲۔ عملی سرگرمیوں سے علیٰحدگی:

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ پردہ عورت کو زندگی کی مختلف سرگرمیوں میں حصّہ لینے سے روک دیتا ہے۔ وہ گھر سے باہر کے کام نہیں انجام دے سکتی۔ اس طرح معاشرہ اپنی نصف آبادی کی فطری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم ہو جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ صرف اسلام ہی عورت کی فطری صلاحیتوں سے صحیح طریقے سے

فائدہ اٹھاتا ہے۔ کوئی بھی نظام اسی وقت ترقی کرسکتا ہے جب اس میں کاموں کی تقسیم متناسب ڈھنگ سے ہو اور جس کے ذمے جو کام لگایا جائے وہ پوری امانت داری اور محنت سے انجام دے۔ اگر ہر شخص ہر کام انجام دینے لگے تو نظام میں خلل وفساد ناگزیر ہے۔ کوئی تجارتی کمپنی اسی وقت صحیح ڈھنگ سے چل سکتی ہے جب اس کے ملازمین میں سے کچھ لوگ اچھی سے اچھی مصنوعات تیار کرنے میں لگے رہیں اور کچھ دوسرے لوگ مارکیٹ میں اس کی پبلسٹی اور نکاسی کے لیے جدّ وجہد کریں۔ اگر اس کمپنی کا ہر ملازم ہر کام اپنے ذمہ لے لے تو وہ ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔ اسی طرح نظامِ تمدن کو چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے درمیان کاموں کو تقسیم کردیا ہے۔ عورت کو گھر کے اندر کے کاموں کی ذمہ داری دی گئی ہے اور مرد کو گھر کے باہر کے کاموں کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ بچوں کی پیدائش اور پرورش وپرداخت ایسا کام ہے جسے صرف عورت ہی انجام دیتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہوگی کہ اس طویل المیعاد اور محنت طلب کام سے تو اسے چھٹکارا نہ ملے، اس کے ساتھ گھر سے باہر کے بھی بہت سے کام اس کے ذمے لگا دیے جائیں۔ اسی لیے اسلام نے عورت کو معاشی جدوجہد سے آزاد رکھا ہے اور نفقہ کی ذمہ داری کلیۃً مرد پر عائد کی ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام عورت کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہی نہیں دیتا ہے اور اسے معاشرتی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے کلیۃً روکتا ہے۔ وقتِ ضرورت عورتوں کے لیے گھر سے باہر نکلنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قد أذن اللّٰه لكنّ أن تخرجن لحوائجكنّ[1]

اللہ تعالیٰ نے تم (عورتوں) کو اجازت دی ہے کہ اپنی ضروریات کے لیے گھر سے باہر جاسکتی ہو۔

عہدِ نبوی میں بہت سی صحابیات گھر سے باہر کے کاموں، مثلاً کھیتی باڑی، صنعت وحرفت اور تجارت وغیرہ میں اپنے شوہروں کی معاونت کرتی تھیں اور غزوات میں شریک ہوکر زخمیوں کو پانی پلانے اور مرہم پٹی کرنے کی خدمت انجام دیتی تھیں۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب خروج النساء بحوائجھن

اسلام عورت کو ہر طرح کے معاشرتی، معاشی اور تمدنی حقوق عطا کرتا ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتی ہے۔ وقتِ ضرورت کسبِ معاش کرسکتی ہے۔ اپنا سرمایہ تجارت میں لگاسکتی ہے۔ علم وثقافت کے فروغ میں حصہ لے سکتی ہے۔ اجتماعی مفاد کے لیے اپنی خدمات پیش کرسکتی ہے۔ لیکن اسلام عورت کو شمعِ محفل نہیں بنانا چاہتا ہے۔ وہ مرد وزن کا آزادانہ اختلاط سخت ناپسند کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ چیز اس کے نظامِ معاشرت سے قطعاً میل نہیں کھاتی۔

۳۔ میلان میں اضافہ:

پردہ کے سلسلہ میں ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان آزادانہ اختلاط پر پابندی عائد کرنے سے عورتوں کی جانب مردوں کے میلان اور رغبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کسی چیز سے روک دینے سے انسان کی حرص اس میں اور بڑھ جاتی ہے۔ اگر انہیں کھلی چھوٹ دے دی جائے تو بہت جلد طبیعتیں سیر ہوجائیں گی اور جذبات سرد پڑ جائیں گے۔

بے پردگی کے حامیوں کا یہ منطقی استدلال بھی خوب ہے۔ اگر سرمایہ داروں کی تجوریوں میں مال ودولت کے ڈھیر دیکھ کر غریبوں کے دلوں میں اس کے حصول کی خواہش پیدا ہو تو کیا یہ مشورہ دینا مناسب ہوگا کہ حفاظت کی تمام تدابیر ختم کردینی چاہئیں اور کھلی چھوٹ دے دینی چاہیے کہ جو چاہے، جتنا چاہے، مال اٹھا کر لے جائے۔ اسی تدبیر سے لوگوں کے دلوں سے مال کی رغبت ختم کی جاسکتی ہے؟ کیا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اخلاقی جرائم پر پابندی سے انسانوں میں جرم کرنے کی خواہش ابھرتی ہے، اگر ارتکابِ جرائم کی مکمل آزادی دے دی جائے تو تمام جرائم پیشہ افراد پرہیزگار بن جائیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تمدن کی تاریخ کے کسی دور میں اس منطق کا استعمال نہیں کیا گیا۔

انسان کی فطری خواہشات دو طرح کی ہیں۔ ایک محدود، جیسے کھانے اور سونے کی خواہشات۔ ان کی جب تکمیل ہوجاتی ہے تو ان سے انسان کی رغبت ختم ہوجاتی ہے۔ دوسری خواہشات وہ ہیں جو غیر محدود ہوتی ہیں۔ مثلاً مال کی خواہش یا جنسی میلان، کہ ان

سے طبیعت کبھی آسودہ نہیں ہوتی۔ جنسی میلان کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک جسمانی، دوسرا روحانی۔ جسمانی تسکین تو بسا اوقات ہو جاتی ہے لیکن روحانی آسودگی کبھی نہیں ہوتی، بلکہ مسلسل ھل من مزید کا تقاضا رہتا ہے۔ مرد وزن کے آزادانہ اختلاط کی صورت میں خواہشات میں سکون اور ٹھہراؤ آنے کے بجائے انہیں ہوا ملے گی اور معاشرہ میں مزید بے حیائی اور آوارگی کو فروغ ہوگا۔

یہ بات بھی پورے طور پر صحیح نہیں کہ جس چیز سے انسان کو روکا جاتا ہے اس کی حرص اس کے اندر بڑھ جاتی ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب ایک طرف اسے روکا بھی جائے اور دوسری طرف اس کی رغبت بھی دلائی جائے۔ لیکن اگر کسی چیز سے روکنے کے ساتھ اس کا ضرر رساں ہونا بھی واضح کیا جائے تو اس کی جانب رغبت پیدا نہیں ہو سکتی۔ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے منع کیا جاتا ہے۔ پھر کسی کے دل میں اس کی خواہش کیوں نہیں پیدا ہوتی؟ اس لیے کہ اسے بتایا جاتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے ہاتھ جل جائے گا۔ یہی حال بے پردگی اور آزادانہ اختلاط کا ہے۔ اگر ان کے سماجی، اخلاقی اور دینی مضرات بتائے جائیں اور ان پر پابندی کی حکمتیں واضح کی جائیں تو لوگوں میں ان کی طرف رغبت پیدا نہیں ہوگی۔

بے پردہ معاشرت:

آج بعض معاشروں میں جو سماجی بُرائیاں عام ہوگئی ہیں، مثلاً طلاق کا بڑھتا ہوا رجحان، اغوا اور عصمت دری کے روز افزوں واقعات، بن بیاہی ماؤں کی کثرت وغیرہ، ان کے اسباب پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک بنیادی سبب بے پردہ معاشرت ہے۔ ان معاشروں میں عورتیں انتہائی زیب و زینت کے ساتھ بلا روک ٹوک، بے حجابانہ مردوں کے سامنے آتی ہیں، اس لیے وہ آسانی سے فتنہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

طلاق کے بعد حلالہ کا حکم

اسلام کے نظامِ طلاق کو صحیح طریقے سے نہ سمجھنے کی وجہ سے غیر مسلم حضرات اس پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ ''اسلام میں بیوی کو طلاق دینے کے بعد اسے واپس لینے کے لیے حلالہ کرانا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ تو طوائف گیری جیسا کام ہوا'' گویا پہلے وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ''اسلام میں حلالہ کرانا ضروری قرار دیا گیا ہے'' پھر اس مفروضہ پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کی اس غلط فہمی میں اضافہ مسلمانوں کی بدعملی سے ہوتا ہے، جو نہ صرف یہ کہ اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل نہیں کرتے، بلکہ اپنی ذاتی خواہشات پوری کرنے کے لئے ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں جنہیں اسلام میں سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ سطورِ ذیل میں اسلام کے ضابطۂ طلاق کی مختصر وضاحت کی جا رہی ہے، امید ہے کہ اس سے مذکورہ اعتراض خود بخود رفع ہو جائے گا۔

طلاق سب سے ناپسندیدہ کام:

اسلام نے معاشرتی زندگی کے جو اصول دیے ہیں وہ انسانی نفسیات سے پوری طرح ہم آہنگ اور حکمتوں پر مبنی ہیں۔ اس نے نکاح کا مقصد نسلِ انسانی کی بقا کے ساتھ زوجین کے مابین ہم آہنگی اور باہم محبت و مودّت قرار دیا ہے اور زوجین کو ایک دوسرے کے لئے باعثِ سکون قرادیا ہے۔ قرآن میں ہے:

وَمِنْ آيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ

بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً (الروم-۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں، تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔ اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔

طلاق کو وہ سخت ناپسندیدہ عمل قرار دیتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا۔

أبغض الحلال الى الله تعالٰى الطلاق [۱]

اللہ تعالٰی کے نزدیک جائز کاموں میں سب سے ناپسندیدہ کام طلاق دینا ہے۔

ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو سب سے زیادہ خوشی اس بات سے ہوتی ہے کہ کسی خاندان کا شیرازہ منتشر ہو جائے اور میاں بیوی میں علیحدگی ہو جائے [۲]

نباہ ممکن نہ ہو تو طلاق کی اجازت ہے:

طلاق کو سخت ناپسندیدہ عمل قرار دینے کے باوجود اسلام نے اس پر پابندی عائد نہیں کی اور اسے یک لخت ممنوع نہیں قرار دیا۔ اس لئے کہ ایسا کرنا معاشرتی تقاضوں اور مصلحتوں کے برخلاف ہوتا۔ بسا اوقات زوجین میں ذہنی ناموافقت پائی جاتی ہے، اس وجہ سے یا دیگر اسباب سے، باوجود ہزار کوششوں کے ان کی یکجائی ممکن نہیں رہتی۔ ایسے حالات میں ایک صورت تو یہ تھی کہ ایک بار نکاح ہو جانے کے بعد زوجین کو مجبور کیا جائے کہ وہ ہر حال میں نباہ کریں، خواہ ایک دوسرے کو کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں اور خواہ ان میں ادنٰی سی بھی موافقت نہ پائی جاتی ہو اور دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں کو اختیار دے دیا جائے کہ اگر باوجود ہزار کوشش کے کسی بھی صورت میں نباہ ممکن نہ ہو تو خوش اسلوبی کے ساتھ علیحدگی اختیار کر لیں۔ اسلام نے دوسری صورت اختیار کی ہے۔ اس لئے کہ یہی انسانی نفسیات اور معاشرتی تقاضوں کے عین مطابق تھی۔ جن مذاہب (مثلاً ہندو مت اور عیسائیت) نے پہلی صورت کو ترجیح دی اور طلاق پر قطعی پابندی عائد کر دی ہے ان میں

---

[۱] سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی کراھیۃ الطلاق

[۲] صحیح مسلم، کتاب صفۃ المنافقین، باب تحریش الشیطان وبعثہ سرایاہ لفتنۃ الناس

زوجین ناموافقت کی صورت میں گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں، یا شوہر اور ان کے گھر والے عورت سے گلو خلاصی کے لئے اسے نذرِ آتش کر دینے میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات آئے دن ہمارے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔

طلاق سے قبل کے اقدامات:

اسلام نے طلاق کی اجازت بدرجۂ مجبوری اس وقت دی ہے جب زوجین کے درمیان موافقت کی تمام تدابیر ناکام ہوگئی ہوں۔ اس سے پہلے وہ متعدد اقدامات کی ہدایت کرتا ہے اور طلاق بھی وہ تدریجاً دینے کا حکم دیتا ہے۔ ان اقدامات کی تفصیل درج ذیل ہے:

اگر بیوی کی طرف سے نافرمانی اور سرکشی کا مظاہرہ ہو تو اسلام نے مرد کو حکم دیا ہے کہ وہ اسے سمجھائے بجھائے، اس کا بستر جدا کر دے اور ضرورت ہو تو اسے ہلکی جسمانی سزا دے۔ قرآن میں ہے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُونَ نَشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ ، فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلاً (النساء - ۳۴)

اور جن عورتوں کی سرکشی کا تمہیں اندیشہ ہو ان کو سمجھاؤ، ان کے بستر جدا کر دو اور انہیں مارو۔ اگر وہ اطاعت کرنے لگیں تو پھر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرو۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی کو ایسی مار مارنے سے منع فرمایا ہے جس سے اس کا بدن زخمی ہو جائے [1]

گھر میں رہتے ہوئے قطعِ تعلق ایک ایسی سزا ہے جسے بیوی زیادہ دنوں تک نہیں جھیل سکتی، لامحالہ وہ شوہر کی اطاعت و فرماں برداری پر مجبور ہوگی۔

بسا اوقات زوجین کو ایک دوسرے سے ایسی شکایات ہوتی ہیں جن کا وہ خود باہم مل کر ازالہ کرنے پر قادر نہیں ہوتے۔ ایسی صورت میں اسلام حکم دیتا ہے کہ دونوں کے خاندان کا ایک ایک نمائندہ مل بیٹھ کر تنازعہ کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ قرآن میں ہے:

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَماً مِّنْ اَهْلِهَا ، اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحاً يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْماً خَبِيْراً . (النساء – ٣٥)

اگر تم میں میاں بیوی کے درمیان اختلاف کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم (فیصلہ کرنے والا) شوہر کے گھر والوں میں سے اور ایک حَکَم بیوی کے گھر والوں میں سے بھیجو، اگر وہ دونوں معاملہ کو سدھارنا چاہیں تو اللہ ان کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔

طلاق کے بعد رجوع کی صورتیں:

اگر اس صورت میں بھی مسئلہ جوں کا توں باقی رہے تو اسلام حکم دیتا ہے کہ شوہر بیوی کو صرف ایک طلاق طہر (یعنی جب ماہ واری نہ آ رہی ہو) کی حالت میں دے۔ طہر کی شرط اس لیے ہے کہ اس حالت میں معمول کے تعلقاتِ زن و شوہر ہونے سے سنجیدہ طلاق کی توقع کی جا سکتی ہے، جب کہ حالتِ حیض میں اس تعلق کے نہ ہونے سے غصے، جھنجھلاہٹ اور ردِ عمل کی کیفیات کی شمولیت ہو سکتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بیوی کو اپنے رویہ پر غور کرنے کا موقع مل سکے اور شوہر بھی اپنے اقدام پر سنجیدگی سے غور کر سکے۔ اس کو طلاق رجعی کہتے ہیں۔ یعنی شوہر عدّت کے اندر جس وقت چاہے بیوی کو واپس لے سکتا ہے۔ محض زبان سے واپس لینے کا اظہار یا عمل سے اس کا ثبوت کافی ہے، نکاح کی ضرورت نہیں ہے (البتہ اگر عدّت گزر جائے تو از سرِ نو نکاح کی ضرورت ہوگی اور یہ دوبارہ نکاح نئے مہر کے ساتھ ہوگا)

اگر ایک طلاق واقع ہو جانے کے باوجود زوجین میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے پر آمادہ نظر نہ آئیں تو اسلام شوہر کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اگلے طہر میں دوسری طلاق دے۔ یہ طلاق بھی رجعی ہوگی۔ یعنی عدّت کے اندر شوہر رجوع کر سکتا ہے۔ لیکن اگر عدّت گزر جائے تو یہ طلاق ''بائن'' ہو جائے گی، یعنی ان کے درمیان علیحدگی ہو گئی، ان کا ازدواجی تعلق ختم ہو گیا اور بیوی کی حیثیت عام عورتوں کی سی ہو گئی۔ اب اگر شوہر اسے واپس لینا چاہے تو اس طرح واپس نہیں لے سکتا جس طرح طلاقِ رجعی کے بعد اسے

واپس لینے کا اختیار تھا، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اب اسے واپس لینے کی کوئی صورت نہ ہو بلکہ اسلام کا حکم یہ ہے کہ اگر دو طلاق کے بعد وہ دوبارہ ازدواجی زندگی گزارنے پر رضامند ہوجائیں تو وہ ایسا کرسکتے ہیں، البتہ اس کے لیے ان کے درمیان نئے مہر کے ساتھ ازسرِ نو نکاح ہونا ضروری ہے۔ قرآن میں ہے:

الطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاک بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ
(البقرة: ۲۲۹)

طلاق دو مرتبہ ہے۔ اس کے بعد یا تو شوہر بیوی کو اچھی طرح رکھے یا خوش اسلوبی سے چھوڑ دے۔

تین طلاق کے بعد رجوع کی کوئی صورت نہیں:

اگر دو طلاق کے بعد وہ ازسرِ نو ازدواجی زندگی گزارنے پر رضامند ہوجائیں، لیکن ان کے درمیان موافقت اور سدھار پائیدار نہ رہ سکے اور پھر ایسے اختلافات رونما ہوجائیں کہ وہ قطعِ تعلق پر آمادہ ہوجائیں تو اسلام انہیں اس آزادی اور حق سے محروم تو نہیں کرتا، لیکن ساتھ ہی شوہر کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ تیسری مرتبہ طلاق بہت سوچ سمجھ کر دے۔ طلاق بچوں کا کھیل نہیں کہ جب جی چاہا بیوی کو طلاق دیدی اور جب چاہا اسے واپس لے لیا۔ وہ نکاح کو ایک محترم ومقدس رشتہ قرار دیتا ہے۔ اس کے تقدس کو قائم رکھنے کے لیے ہی وہ شوہر کو وارننگ دیتا ہے کہ اگر اس نے تیسری مرتبہ بھی طلاق دے دی تو اب بیوی اس کے لیے قطعاً حرام ہوجائے گی۔ اب وہ اسے واپس نہیں لے سکتا۔ جو شوہر اپنی بیوی کو ایک بار نہیں، دو بار نہیں، بلکہ تین بار طلاق دے چکا ہو وہ اس قابل نہیں کہ اب وہ عورت اس کی بیوی بن کر رہ سکے۔ وہ اس مرد کو اس عورت سے بالکلیہ محروم کرکے اب سماج کے دوسرے مردوں کو اجازت دیتا ہے کہ اس عورت کو بے یارومددگار نہ چھوڑیں، بلکہ اسے اپنی زوجیت میں لیں۔ لیکن اگر دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے یا اس کی وفات ہوجائے اور اب وہ دونوں (یعنی عورت اور اس کا پہلا شوہر) پھر رشتۂ زوجیت میں منسلک ہونا چاہیں تو اسلام انہیں ایسا کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ قرآن میں ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجاً غَيْرَهٗ ، فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَتَرَاجَعَا اِنْ ظَنَّا اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ

(البقرة: ۲۳۰)

پھر اگر شوہر (تیسری مرتبہ) طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک کہ کسی دوسرے مرد سے اس کا نکاح نہ ہو جائے اور وہ اسے طلاق نہ دے دے۔ (اگر دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے) تو کوئی حرج نہیں ہے اگر وہ دونوں دوبارہ باہم نکاح کرنا چاہیں، اگر انہیں امید ہو کہ وہ اللہ کی بتائی ہوئی حدود پر قائم رہیں گے۔

اسلام کے نظامِ طلاق کو اتنی تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی، تاکہ واضح ہو سکے کہ اس نے جن حالات میں طلاق کی اجازت دی ہے اور اس کا جو طریقہ بتایا ہے وہ سراسر انسانوں کے لیے رحمت ہے اور اس میں انسانی نفسیات اور معاشرتی پیچیدگیوں اور ضرورتوں کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

حلالہ کرنا اور کروانا دونوں ناجائز ہیں:

غلط فہمی دراصل مسلمانوں کے اسلامی طریقۂ طلاق سے ناواقفیت اور غلط طریقے سے طلاق دینے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ آج کل بعض مسلمان کسی بات پر طیش میں آ کر تین طلاقیں دے کر بیوی کو علیٰحدہ کر دیتے ہیں اور اس آسانی سے خود کو محروم کر لیتے ہیں جو اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کرنے سے انھیں حاصل ہو سکتی تھی۔ پھر جب جلد ہی اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں تو بیوی کو واپس لینے کی کوئی تدبیر ان کے سامنے نہیں ہوتی، اس کے سوا کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اس بات پر رضامند کر لیں کہ وہ اس عورت سے نکاح کر کے اسے طلاق دے دے، تاکہ دوبارہ ان کے لیے اس عورت سے نکاح جائز ہو جائے۔ اس عمل کو حلالہ کہتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک غلط طریقہ ہے۔ جو شخص حلالہ کرواتا ہے وہ بھی غلط کام کرتا ہے اور جو شخص اس پر رضامند ہوتا ہے وہ بھی ایک گھناؤنی حرکت کرتا ہے۔ اسلام میں اس طریقہ کو سخت ناپسند قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

لعن الله المحلّل و المحلّل له [1]

جو شخص حلالہ کرتا ہے اور جو شخص حلالہ کرواتا ہے دونوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حلالہ کرنے والے اور حلالہ کروانے والے دونوں پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت بھیجی ہے۔ [2]

آں حضرت ﷺ نے حلالہ کرنے والے کے بارے میں سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے ‘‘کرائے کا سانڈ’’ قرار دیا ہے۔ حضرت عقبہ بن عامر ؓ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا: ‘‘کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ ‘‘کرایہ کا سانڈ’’ (التیس المستعار) کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا۔ ہاں، کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا: ‘‘یہ وہ شخص ہے جو حلالہ کرتا ہے’’ [3]

☆ ☆ ☆

---

[1] سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب المحلل والمحلل لہ

[2] جامع ترمذی، ابواب النکاح، باب ما جاء فی المحلل والمحلل لہ، سنن ابی داؤد، باب التحلیل اور دیگر کتب حدیث

[3] سنن ابن ماجہ، حوالہ سابق

حیوانات کے حقوق

اس دنیا میں جب سے انسان کا وجود ہے، حیوانات بھی پائے جاتے ہیں۔ ان میں وہ حیوانات بھی ہیں جن سے انسان مختلف طرح کے کام لیتا اور فائدے اٹھاتا ہے۔ حیوانات کے حقوق اور ان کے تحفظ کے سلسلے میں گزشتہ کچھ عرصے سے کافی بیداری آئی ہے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر مختلف سرکاری اور غیر سرکاری تنظیمیں اس کے لیے سرگرم ہیں۔ ان کے تحفظ کے لیے بعض قوانین بھی منظور کیے گئے ہیں۔ اسلام نے گوشت خوری کی اجازت دی ہے۔ اس بنا پر ایک عام تاثّر یہ ہے کہ اسلام میں حیوانات کے حقوق کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ جو مذہب حیوانات کو جینے کا حق نہ دیتا ہو، اس سے ان کے دیگر حقوق کی حفاظت ورعایت کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ سطورِ ذیل میں اس تاثّر اور اعتراض کا جائزہ لینے اور حقوقِ حیوانات کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات کا مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن اس سے پہلے حیوانات کے بارے میں قدیم وجدید رویّے پر ایک نظر ڈال لینا مفید ہوگا۔ اس سے اسلامی اور غیر اسلامی نقطۂ نظر کا موازنہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

حیوانات کے بارے میں قدیم تصوّرات:

حیوانات کے بارے میں قدیم تصوّرات افراط وتفریط کا شکار نظر آتے ہیں۔ ایک طرف بعض قوموں میں حیوان پرستی کا رجحان ملتا ہے تو دوسری طرف بعض لوگ اس کے ’’بے روح مخلوق‘‘ ہونے کے قائل ہیں۔

قدیم مذاہب میں بعض دیویوں اور دیوتاؤں کو حیوانات کی شکل میں ظاہر کیا جاتا تھا۔ ان کے ماننے والوں کا عقیدہ تھا کہ دیوی دیوتا کی مخصوص مقدّس قوت کا اظہار اس کے مناسبِ حال کسی جانور کی شکل میں ہوتا ہے۔ مثلاً اولاد دینے والے دیوتا کی صورت گری بیل کی شکل میں کی جاتی ہے۔ یونان میں عقل کی دیوی Athena کو الّو کی شکل میں دکھایا جاتا تھا۔ اگرچہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جن حیوانات کی شکلوں میں ان دیوی دیوتاؤں کے مجسّمے بنائے جاتے تھے، ان حیوانات کو بھی مقدّس خیال کیا جاتا تھا اور ان کی پرستش ہوتی تھی۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسانی تہذیب کے ابتدائی دور میں بعض حیوانات کی پرستش کی جاتی تھی۔ بعد میں انہی جانوروں کی شکل میں دیوتاؤں کی مورتیاں بنالی گئیں۔ [۱]

قدیم مصر میں بعض حیوانات مثلاً گائے کو مقدّس خیال کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں بھی اس طرح کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔

اس کے برخلاف بعض فلاسفہ ایسے بھی گزرے ہیں جو حیوانات کو ذی روح مخلوق نہیں مانتے تھے۔ مثلاً فرانس کے ایک فلسفی Rene Descartes کا عقیدہ تھا کہ حیوانات میں روح نہیں ہوتی ہے۔ اس کے خیال میں کسی بھی ذی روح کے لیے ضروری ہے کہ اس میں سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت ہو اور چوں کہ حیوانات میں روح نہیں ہوتی اس لیے لازمی ہے کہ ان میں درد کا احساس نہ ہو۔ وہ حیوانات کو ”متحرک مشینیں“ کہتا تھا۔ وہ اور اس کے پیروکار تعجب انگیز لہجے میں کہتے تھے کہ ”یہ مشینی روبوٹ ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن سے ان کے کرب اور تکلیف میں مبتلا ہونے کا وہم ہوتا ہے“

اٹھارہویں صدی عیسوی کے انگریز قانون داں Jeremy Bentham نے اسی بات کو دوسرے انداز میں یوں کہا ہے:

”سوال یہ نہیں ہے کہ کیا حیوانات سمجھ بوجھ رکھتے ہیں؟ یا کیا وہ بات چیت کرسکتے ہیں؟ بلکہ سوال اس بات کا ہے کہ کیا وہ تکلیف محسوس کرتے ہیں؟“ [۲]

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع ۱۹۹۴ء، جلد اول، ص: ۴۲، عنوان Animal worship

[۲] حوالہ سابق، عنوان Animal Cruelty of,

اہلِ روم میں حیوانات کے وحشیانہ کھیل کا رواج تھا اور اس کے لیے بڑے بڑے اسٹیڈیم قائم تھے جہاں انہیں لڑایا جاتا تھا اور لوگ ان کا تماشا دیکھتے اور اس سے محظوظ ہوتے تھے۔

حقوقِ حیوانات کے سلسلے میں بیداری:

گزشتہ چند صدیوں میں حیوانات کے حقوق اور ان کے تحفّظ کے سلسلے میں مغربی ممالک میں بیداری آئی ہے اور مختلف قوانین منظور کیے گئے ہیں اور سوسائٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا قانون ۱۶۴۱ء میں Massachusctts Bay Colony (U.S) کے لیگل کوڈ میں شامل ہوا۔ ۱۸۰۹ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایوانِ بالا کے ممبر Erskine نے پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا جس میں گھوڑے، خنزیر، گائے بیل، بھیڑ بکری جیسے جانوروں کو ظلم اور اذیت رسانی سے تحفظ فراہم کرنے کی بات کہی گئی تھی۔ ایوانِ بالا House of Lords کے ممبران نے تمسخر کے ساتھ اس بل کو منظوری دے دی، مگر ایوانِ زیریں House of Commons میں اسے رد کر دیا گیا۔ ۱۸۲۲ء میں Rchard Martin گھریلو اور پالتو جانوروں کے بارے میں ایک قانون پاس کروانے میں کامیاب ہو گیا جس کا نام اس کی نسبت سے Martin Act رکھا گیا۔ اس کے دو سال بعد ۱۸۲۴ء میں انگلینڈ میں تحفظِ حیوانات کے سلسلے میں دنیا کی سب سے پہلی سوسائٹی Animal welfare society کے نام سے قائم ہوئی (۱۸۴۰ء میں ملکہ وکٹوریہ کی ہدایت پر اس سوسائٹی کے نام کے شروع میں Royal کا اضافہ کر دیا گیا۔)

فرانس بھی اس معاملے میں پیچھے نہ رہا۔ ۱۸۴۵ء میں Jacques Delmas de Grammont نے General society for the protection of animals قائم کی۔ ۱۸۵۰ء میں اس نے انگلینڈ کے قانون کی طرح ایک قانون منظور کروایا جو Law Grammont کے نام سے مشہور ہوا۔ آئر لینڈ، جرمنی، بلجیم، آسٹریا اور نیدر لینڈ میں بھی اسی طرح کے قوانین منظور ہوئے اور سوسائٹیاں قائم ہوئیں۔ تحفّظِ حیوانات کے سلسلے میں ایک اہم نام ولایاتِ متحدہ کے ہنری برگ

(Henry Bergh) کا ہے جو روس میں ابرہام لنکن کے وزیر (سفیر) تھے۔ سینٹ بطرس برگ میں برگ نے ایک مرتبہ Droshky (روس میں چار پہیوں کی ایک گاڑی) کے ایک ڈرائیور کو دیکھا جو گھوڑے کو بری طرح پیٹ رہا تھا۔ اسی وقت سے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک برگ نے حیوانات پر ظلم اور اذیت رسانی کے خلاف ایک مہم چلائی اور بھینسوں کی لڑائی سے لے کر زندہ جانوروں کی چیر پھاڑ (Vivisection) تک، ہر معاملے کی مخالفت کی۔ برگ کی کوششوں سے ۱۸۶۶ء میں نیویارک میں امریکہ کی پہلی تحفظِ حیوانات سوسائٹی قائم ہوئی۔ اس کا نام The American Society for the prevention of cruelty to animals تھا۔

بیسویں صدی کے اواخر میں دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں حیوانات کی بہبود کی سوسائٹیاں قائم ہوگئیں اور ان کے تحفظ کے لیے قوانین منظور کیے گئے۔ متعدد بین الاقوامی ادارے بھی قائم ہوئے۔ ان میں تین ادارے اہم ہیں:

۱۔ World Federation for the Protection of animals۔ اس کا ہیڈکوارٹر Zurich میں ہے۔

۲۔ The International Society for the protection of animals اس کا ہیڈکوارٹر لندن میں ہے۔

۳۔ The International fund for animal welfar اس کا ہیڈکوارٹر Yarmouth, Mass (U.S) میں ہے[1]

اسلام اور حیوانات:

حیوانات کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر افراط و تفریط کے درمیان مبنی بر اعتدال ہے۔ وہ نہ تو انہیں تقدیس کے مقام پر فائز کرتا اور انسانوں کو ان کے سامنے اپنی جبینِ نیاز خم کرنے کا حکم دیتا ہے اور نہ ان کے حقوق سے غفلت برتتا اور انسانوں کو کھلی چھوٹ دیتا ہے کہ جس طرح چاہیں انہیں ظلم و تشدد کا نشانہ بناتے رہے۔

اسلام اس کائنات میں انسانوں اور حیوانوں کی حیثیت متعین کرتا، ان کے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، حوالہ سابق، عنوان "Animal cruelty of"

باہمی روابط کے حدود واضح کرتا اور ان کے ساتھ برتاؤ کے تفصیلی احکام دیتا ہے۔ حقوقِ حیوانات کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کو کائنات، انسان اور دیگر مخلوقات کے بارے میں اسلام کے عمومی نقطۂ نظر کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے:

۱۔ اسلام کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں بے شمار مخلوقات پیدا کی ہیں اور ان کے ذمّے مختلف کام سونپے ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب یہ کائنات فنا ہو جائے گی اور وہ سب اللہ کے رُو برُو حاضر ہوں گے۔ ان مخلوقات میں حیوانات بھی ہیں۔ قرآن میں ہے:

> وَمَامِنْ دَابَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلاَ طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَافَرَّطْنَافِی الْكِتَابِ مِنْ شَئيٍ ءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ (الأنعام: ۳۸)
>
> اور جتنے قسم کے جان دار زمین پر چلنے والے ہیں اور جتنے قسم کے پرندے ہیں کہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں ان میں کوئی قسم ایسی نہیں جو تمہاری طرح کے گروہ نہ ہوں۔ ہم نے دفتر (لوحِ محفوظ) میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (سب کچھ لکھ لیا ہے) پھر سب اپنے پروردگار کے پاس جمع کیے جاویں گے۔

۲۔ کائنات کی تمام مخلوقات بشمول حیوانات اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح میں مصروف ہیں اور ان کے ذمّے جو کام دیا گیا ہے اسے بخوبی انجام دے رہی ہیں۔ انسانوں کو اس معاملے میں اختیار و ارادہ کی آزادی بخشی گئی ہے کہ وہ چاہیں تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے کام کریں اور اس کے انعامات کے مستحق ٹھہریں اور چاہیں تو اس کی نافرمانی اور معصیت کے کام کریں اور مستحق عذاب بنیں۔

> اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِیْ السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِیْ الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِیْرٌ مِنَ النَّاسِ (الحج: ۱۸)
>
> کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سربسجود ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان۔

سورۂ نور میں بھی یہی مضمون معمولی فرق سے بیان ہوا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (النور: ۴۱)

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں؟ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے۔

۳۔ کائنات کی تمام مخلوقات کے لیے روزی کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ اس نے دنیا میں مخلوقات کی غذا بننے والی لاتعداد چیزیں مختلف شکلوں میں بکھیر دی ہیں جو ان کے استعمال میں آتی ہیں:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود: ٦)

زمین میں چلنے والا کوئی جان دار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو

اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعَاهَا وَالْجِبَالَ اَرْسَاهَا مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (النازعات: ۳۱۔۳۳)

اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑ اس میں گاڑ دیے، سامانِ زیست کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے۔

۴۔ اس کائنات میں کلیدی حیثیت انسانوں کو حاصل ہے۔ یہ بزم انہی کے لیے سجائی گئی ہے۔ یہاں کی ساری چیزیں انہی کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ تاکہ وہ انہیں اپنے کام میں لائیں، ان سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے رب کا شکر بجالائیں۔ اس دنیا میں وہ آزمائش کی حالت میں ہیں۔ اگر وہ ان نعمتوں پر شکر گزاری کے جذبے سے اپنے رب پر ایمان لائیں گے اور اس کے حکموں پر چلیں گے تو وہ ان سے خوش ہوگا اور انہیں انعامات و اکرامات سے نوازے گا، لیکن اگر وہ بے جا تصرفات کریں گے اور اس کی حکم عدولی کریں گے تو نافرمان اور ناشکر قرار پائیں گے۔ قرآن کریم میں ایک ایک کر کے یہ نعمتیں تفصیل سے گنائی گئی ہیں اور بحیثیتِ مجموعی بھی ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (البقرة: ۲۹)

وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمان۔۲۰)

کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمان کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔

اسلام کہتا ہے کہ کائنات کی دیگر اشیاء کی طرح حیوانات بھی انسانوں کے فائدے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اس لیے انہیں حق پہنچتا ہے کہ ان سے کام لیں اور ہر طرح سے فائدہ اٹھائیں، ان پر سواری کریں، انہیں بار برداری میں استعمال کریں، ان کا دودھ پئیں، ان کے چمڑے، اون اور بالوں سے مختلف مصنوعات تیار کریں اور ان سے دیگر منافع حاصل کریں۔ قرآن کریم میں انسانوں کو حاصل مختلف نعمتوں کے تذکرے کے ساتھ حیوانات سے حاصل ہونے والے مختلف فائدوں کو بیان کیا گیا ہے۔

سورۂ نحل میں ہے:

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بَالِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ، اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً وَّيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (آیت: ۵۔۸)

اس نے جانور پیدا کیے جن میں تمہارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی۔ ان میں تمہارے لیے جمال ہے جب کہ تم انہیں چرنے کے لیے بھیجتے ہو اور جب کہ شام انہیں واپس لاتے ہو۔ وہ تمہارے لیے بوجھ ڈھو کر ایسے ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جاں فشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔ اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے، تا کہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں۔ وہ اور بہت سی چیزیں (تمہارے فائدے کے لیے) پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم تک نہیں ہے۔

اسی سورت میں ایک دوسری جگہ حیوانات کے بعض منافع کا بیان ہے:

وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ (النحل :۸۰)

اس نے جانور کی کھالوں سے تمہارے لیے ایسے مکان پیدا کیے جنھیں تم سفر اور قیام دونوں حالتوں میں ہلکا پاتے ہو۔ اس نے جانور کے صوف اور اون اور بالوں سے تمہارے لیے پہننے اور برتنے کی بہت سے چیزیں پیدا کردیں جو زندگی کی مدتِ مقررہ تک تمہارے کام آتی ہیں۔

حیوانات سے حاصل ہونے والے دودھ کو قرآن اللہ کی نعمت قرار دیتا ہے:

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نَسْقِيْكُمْ مِمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَبَنًا خَالِصاً سَائِغًا لِلشَّارِبِيْنَ (النحل ۔٦٦)

اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوش گوار ہے۔

قرآن حیوانات اور ان سے حاصل ہونے والے فائدوں کو اللہ کی نشانیاں قرار دیتا ہے اور ان پر غور کرنے اور ان سے رہنمائی حاصل کرنے کی تاکید کرتا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاكُلُوْنَ ،وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِىْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ وَيُرِيْكُمْ اٰيَاتِهٖ فَاَىَّ اٰيَا تِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ (المومن :۷۹۔۸۱)

اللہ ہی نے تمہارے لیے یہ مویشی جانور بنائے ہیں، تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ۔ ان کے اندر تمہارے لیے اور بھی بہت سے منافع ہیں۔ وہ اس کام بھی آتے ہیں کہ تمہارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو وہاں تم ان پر پہنچ سکو۔ ان پر بھی اور کشتیوں پر بھی تم سوار کیے جاتے ہو۔ اللہ اپنی یہ نشانیاں تمہیں دکھا رہا ہے۔ آخر تم اس کی کن کن نشانیوں کا انکار کروگے۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے فائدے کے لیے مویشی پیدا کیے ہیں، مثلاً اونٹ، گائے، بھیڑ بکری وغیرہ۔ ان سے وہ مختلف کام لیتے ہیں، مثلاً ان پر سواری کرتے ہیں، ان کا گوشت کھاتے ہیں، ان سے دودھ حاصل کرتے ہیں، ان پر بوجھ لادتے ہیں، ان سے کھیت جوتتے ہیں، ان کے اون، بال اور چمڑے سے لباس، گھریلو سازو سامان اور دیگر چیزیں تیار کرتے ہیں۔ ان آیات میں اللہ اپنے بندوں پر یہ احسانات جتا رہا ہے“[1]

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اپنی بہت سی نشانیوں کا ذکر کیا ہے۔ انہیں ہر شخص کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ ان میں سے کوئی نشانی ایسی نہیں جس کا انکار کیا جا سکے۔[2]

حیوانات کا خیال رکھنے کی تاکید:

اسلام حیوانات سے کام لینے اور ان سے مختلف فائدے اٹھانے کی اجازت دیتا ہے، لیکن ساتھ ہی اس نے ان کے حقوق کی بھی پوری رعایت کی ہے۔ وہ ان کا خیال رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ انہیں کسی طرح کی اذیت دینے کی ممانعت کرتا اور انہیں آرام اور سہولت پہنچانے کو باعثِ اجر قرار دیتا ہے۔ اس معاملے میں اسلامی شریعت اس قدر حساس ہے کہ اس سلسلہ کی معمولی معمولی جزئیات تک کی صراحت کر دی گئی ہے۔ احادیث میں ایسے بکثرت واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنے اصحاب کو حیوانات کے حقوق کی نگہداشت رکھنے اور ان سے غفلت نہ برتنے کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔ کبھی آپ اس معاملے میں صحابہ کی جانب سے کوتاہی کا مشاہدہ کرتے تو انہیں سخت تنبیہ فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ کھجور کے باغ کے ایک احاطہ میں تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ وہاں ایک اونٹ بندھا ہوا ہے، جو بھوک سے بلبلا رہا ہے۔ آپ اس کے پاس گئے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر دریافت فرمایا: اس اونٹ کا مالک کون ہے؟ یہ اونٹ کس کا ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے

---

[1] تفسیر ابن کثیر، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر، ۱۹۳۷ء، ۸۹/۴

[2] تفسیر کبیر، رازی، المطبعۃ العامرۃ مصر، ۳۳۰/۷

رسول: یہ میرا ہے۔ آپ ﷺ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا:

افلا تتقی اللہ فی ھذہ البھیمة التی ملّکک اللہ ایاھا ۱

کیا اس جانور کے بارے میں، جس کا تجھے اللہ نے مالک بنایا ہے، تجھے اللہ کا خوف نہیں ہے۔

حکم ہے کہ اگر کسی جانور سے سواری یا بار برداری کا کام لیا جائے تو اس کے چارے پانی کا بھی معقول انتظام رکھا جائے۔ اس کی بھوک پیاس کا خیال رکھے بغیر مسلسل اس سے کام لینا صحیح نہیں ہے۔ آں حضرت ﷺ نے ہدایت کی ہے کہ سفر کے دوران کچھ کچھ وقفہ سے جانور کو چرنے کا موقع دینا چاہیے۔ آپؐ نے فرمایا:

اذا سافرتم فی الخصب فاعطوا الابل حظّھا من الأرض ۲

سفر میں تمہارا سرسبز مقامات سے (اونٹ پر) گزر ہو تو اسے زمین سے اپنا حق حاصل کر لینے دو (یعنی اسے چرنے کا موقع دو)

حیوانات کو آرام پہنچانا باعثِ اجر ہے:

جانوروں سے ہمدردی کرنے، اُن کی بھوک پیاس کا خیال رکھنے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا اسلام نے نہ صرف حکم دیا ہے، بلکہ ان کاموں کو اجر و ثواب کا باعث قرار دیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں لوگوں کی نظروں سے یہ تصور اوجھل تھا۔ ان کے خیال میں بھی نہیں آتا تھا کہ یہ کام بھی باعث اجر ہو سکتے ہیں۔ وہ اس پر حیرت کا اظہار کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر اللہ کے رسول ﷺ وضاحت فرماتے کہ کسی بھی جان دار کو آرام پہنچانے سے آدمی اجر کا مستحق ہو جاتا ہے۔

حضرت سراقہ بن جعشمؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک موقع پر دریافت کیا کہ میں نے اپنے اونٹوں کو پانی پلانے کے لیے حوض بنا رکھے ہیں۔ کبھی کبھی بھولے بھٹکے دوسرے اونٹ بھی ان حوضوں پر آ جاتے ہیں۔ اگر میں ان کو پانی پلا دوں تو کیا اس پر اجر ملے گا؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

---

[۱] سنن ابن داؤد، کتاب الجہاد، باب مایومر بہ من القیام عن الدواب والبہائم، یہ حدیث صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ میں بھی مختصراً مروی ہے۔

[۲] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر، سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب سرعۃ السیر۔

نعم، في كل ذات كبد حرىٰ أجر[۱]

ہاں ہر جان دار (کو آرام پہنچانے) پر اجر ملتا ہے۔

بھوک پیاس کی تکلیف بسا اوقات ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ اس کا اندازہ ان لوگوں کو بخوبی ہوگا جو کبھی اس سے دوچار ہوئے ہوں۔ کسی جانور کو بھوک سے نڈھال یا پیاس سے تڑپتا دیکھ کر انسان کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہونا کہ اس کی تکلیف دور کرنی چاہیے، اللہ کے نزدیک بہت قابلِ قدر ہے۔ انسان کتنا ہی گنہ گار کیوں نہ ہو، بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس جذبے کی وجہ سے اس کی مغفرت فرمادے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا یہ پسندیدہ عمل اس کے گناہوں کو ڈھانپ لے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسے بعض واقعات بیان کر کے شہادت دی ہے کہ جانوروں کو آرام پہنچانے کا یہ عمل گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ بن گیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ آں حضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک کتا سخت گرمی میں ایک کنویں کے چکّر لگا رہا تھا۔ پیاس کے شدّت سے اس کی زبان باہر نکل آئی تھی اور اس کی جان پر بنی تھی۔ ایک عورت نے اسے اس حال میں دیکھا تو اسے بڑا ترس آیا۔ اس کے پاس کنویں سے پانی نکالنے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی اس نے اپنا موٹا موزا نکالا اور اس میں پانی بھر کر اس کتے کو پلا دیا۔ وہ عورت بدکار تھی۔ اللہ تعالیٰ نے (اس عمل کی وجہ سے) اس کی مغفرت کر دی[۲]

ایک دوسرا واقعہ بھی حضرت ابو ہریرہؓ نے آں حضرت ﷺ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں اسے زور کی پیاس لگی۔ اس نے ایک کنویں میں اتر کر پانی پیا۔ باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک کتا پیاس کی شدت سے ہانپ رہا ہے اور پیاس مٹانے کے لیے کیچڑ چاٹ رہا ہے۔ اس نے سوچا، یہ کتا بھی پیاس سے اسی طرح بدحال ہے جس طرح میں تھا، (اس کی پیاس بجھانی چاہیے)، وہ کنویں میں اترا، اپنے

---

[۱] سنن ابن ماجہ، ابواب الادب، باب فضل صدقۃ الماء

[۲] صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب بدون ترجمہ، مسند احمد، ۲/۵۰۷

موزے میں پانی بھرا، اسے منہ میں پکڑ کر باہر نکلا اور اس کتے کی پیاس بجھائی۔ اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل سے خوش ہوا اور اس کی مغفرت کردی۔[1]

یہ واقعہ سن کر غالباً صحابۂ کرام کو حیرت ہوئی ہوگی۔ انہیں اس پر یقین نہ آرہا ہوگا کہ اتنا معمولی اور حقیر عمل بھی کسی کی مغفرت کا ذریعہ بن سکتا ہے اور اس پر وہ اجر کا مستحق بن سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے آن حضرت ﷺ سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول کیا جانوروں کو آرام پہنچانے پر ہمیں اجر ملے گا؟ آپ نے ارشاد فرمایا:

فی کل ذات کبد رطبة أجر[2]

ہر جان دار (کو آرام پہنچانے) پر اجر ملتا ہے۔

حیوانات کو اذیّت دینا گناہ ہے:

دوسری طرف اسلام نے جانوروں کو تکلیف پہنچانے اور انہیں اذیت دینے سے سختی سے منع کیا ہے اور اسے گناہ قرار دیا ہے۔ جانوروں کے بارے میں بے حسی ہر دور میں عام رہی ہے۔ ان سے ان کی طاقت سے بڑھ کر کام لیا جاتا ہے۔ ان کے چارہ کا معقول انتظام نہیں کیا جاتا۔ انہیں تفریحِ طبع کا سامان سمجھا جاتا ہے۔ اسلام ان کے بارے میں ان رویّوں کو غلط قرار دیتا ہے اور ان سے احتراز کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ عہدِ نبوی میں بھی لوگ اس بے حسی کا شکار تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس پر تنبیہ فرمائی۔ آپؐ نے بہت لطیف انداز میں صحابہ کو اس جانب متوجہ کیا۔ فرمایا:

لو غُفر لکم ما تأتون الی البهائم لغفر لکم کثیراً[3]

تم لوگ جانوروں کے ساتھ جو (بدسلوکیاں) کرتے ہو اگر انہیں معاف کردیا جائے تو سمجھ لو کہ تمہارے بہت سے گناہ معاف کردیے گئے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحرث والمساقاۃ، باب فضل سقی الماء، کتاب الادب، باب رحمۃ الناس والبہائم، صحیح مسلم کتاب السلام، باب فضل ساقی البہائم المحترمۃ واطعامہا، موطا امام مالک، کتاب صفۃ النبی، باب جامع ماجاء فی الطعام والشراب

[2] حوالہ سابق

[3] مسند احمد، ۴۴۱/۶ عن ابی الدرداء

اذیّت رسانی کی مختلف شکلیں:

اس اجمالی ہدایت کے ساتھ آں حضرت ﷺ نے اذیت رسانی کی بعض متعین شکلوں کی نشان دہی بھی فرمائی ہے، ان سے بچنے کی تاکید کے ساتھ انہیں اختیار کرنے والوں پر لعنت بھیجی اور وعید سنائی ہے۔ ذیل میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

الف: بھوکا پیاسا رکھنا:

پالتو جانوروں کے چارہ پانی کا خیال نہ کرنا اور انہیں بھوکا پیاسا رکھنا اسلام کی نظر میں سخت ناپسندیدہ اور موجبِ گناہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک عورت کا واقعہ بیان کیا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ کر رکھا، اسے کھانے پینے کے لیے کچھ دیا نہ آزاد چھوڑ دیا کہ وہ اپنی روزی خود تلاش کرلے، یہاں تک کہ وہ مرگئی۔ اس بنا پر وہ عورت اللہ کے عذاب کی مستحق ٹھہری۔[1]

ب: کوئی نازک عضو پکڑ کر کھینچنا:

اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ جانور کا کوئی نازک عضو پکڑ کر اس طرح کھینچا جائے کہ اسے تکلیف محسوس ہو۔ بکری یا اس طرح کے دیگر جانور، جن کے کان لمبے ہوتے ہیں، دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ انہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ان کا کان پکڑ کر کھینچتے ہیں۔ تکلیف سے وہ جانور چیختے چلاتے ہیں مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اللہ کے رسول ﷺ نے ایسا کرنے سے منع کیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ کا ایک جگہ سے گزر ہوا۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص ایک بکری کا کان پکڑے ہوئے اسے کھینچ کر لے جارہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحرث والمساقاۃ، باب فضل سقی الماء، صحیح مسلم، کتاب البر، باب تحریم تعذیب الہرۃ۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ دونوں سے مروی ہے۔

دع أذنها وخذ بسالفتها [1]

اس کا کان چھوڑ دو اور گردن کا اگلا حصہ پکڑ لو۔

ج: اسٹیج بنانا:

یہ چیز بھی مناسب نہیں ہے کہ جانوروں پر بلا ضرورت دیر تک سوار رہا جائے۔ کہیں آنے جانے کے لیے انہیں سواری یا بار برداری کے کام میں لایا جا سکتا ہے، کہ ان کی تخلیق کا ایک مقصد یہ بھی ہے، لیکن ایک ہی جگہ کھڑا رکھ کر ان پر سواری کی جائے اور تقریر کرنے کے لیے انہیں اسٹیج بنا لیا جائے، یہ مناسب نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

ايّاكم أن تتّخذوا دوابّكم منابر، فان الله انّما سخّرها لكم لتبلغكم الى بلد لم تكونوا بالغيه الاّ بشقّ الأنفس وجعل لكم الأرض فعليها فاقضوا حاجتكم [2]

— اپنے جانوروں کو منبر نہ بناؤ۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارے قبضے میں اس لیے دیا ہے، تا کہ ان کے ذریعہ تم ان مقامات تک پہنچ سکو جہاں سخت جاں فشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ (منبر کے لیے) اللہ نے زمین بنائی ہے، اسی پر اپنی ضرورت پوری کرو۔

د: جسم کا کوئی ٹکڑا کاٹ لینا: -

اسلام اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیتا کہ کسی زندہ جانور کے جسم کا کوئی ٹکڑا کاٹ لیا جائے۔ اس لیے کہ اس سے اس جانور کو سخت تکلیف ہوگی۔ اللہ کے رسول ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو وہاں دیکھا کہ لوگ اونٹ کے کوہان اور بھیڑ کی چکتی (ان جانوروں کے زندہ ہونے کی حالت میں) کاٹ کر کھاتے ہیں۔ آپؐ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا اور اس کٹے ہوئے ٹکڑے کا کھانا ناجائز قرار دیا۔ فرمایا:

---

[1] سنن ابن ماجہ، ابواب الذبائح، باب اذا ذبحتم فاحسوا الذبح

[2] سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی الوقوف علی الدابۃ

ما قُطع من بهيمة وهي حيّة فهو ميتة [۱]

کسی زندہ جانور کے جسم کا کوئی ٹکڑا کاٹ لیا جائے تو وہ مردار کے حکم میں ہے، اسے کھانا جائز نہیں۔

ہ: نشانہ بازی کی مشق کرنا:

ایک طریقہ یہ رائج تھا کہ لوگ کسی چھوٹے جانور، مثلاً مرغی یا کسی پرندے کو باندھ کر اس پر نشانہ بازی کی مشق کرتے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کام کے لیے کسی جان دار کو استعمال کرنے کی سخت ممانعت فرمادی۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا تتّخذوا شيئاً فيه الروح غرضاً [۲]

کسی جاندار پر نشانہ مت لگاؤ۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے نشانہ بازی کے لیے کسی جاندار کو ہدف بنانے والے شخص پر لعنت فرمائی ہے۔ [۳]

اسی بنا پر حضرت ابن عمرؓ جہاں بھی کسی کو ایسا کرتے ہوئے دیکھتے، اسے روک دیتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ یحییٰ بن سعید کے پاس گئے۔ دیکھا کہ یحییٰ کے خاندان کا ایک لڑکا ایک مرغی کو باندھے اس پر نشانہ لگا رہا ہے۔ انہوں نے جا کر اسے کھول دیا، پھر دونوں کو پکڑے ہوئے یحییٰ کے پاس لے گئے اور فرمایا: اس لڑکے کو منع کردو کہ اس پرندے کو باندھ کر اس پر نشانہ نہ لگائے، اس لیے کہ نبی ﷺ نے ایسا کرنے سے منع کیا ہے [۴]

ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں کچھ نوعمر لڑکے ایک پرندہ کو باندھے اس پر نشانہ بازی کر رہے تھے۔ انہوں نے پرندے کے مالک سے طے کر رکھا تھا کہ جتنے تیر خطا کریں گے اسی کے حساب سے وہ اسے متعین رقم ادا کریں

---

[۱] سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، باب فی صید قطع منہ قطعۃ، جامع ترمذی، ابواب الصید، باب ما قطع من الحی فھو میت، مسند احمد، ۲۱۸/۵ عن ابی واقد اللیثی

[۲] صحیح مسلم، کتاب الصید، باب النہی عن صبر البہائم

[۳] صحیح مسلم، حوالہ سابق

[۴] صحیح بخاری، کتاب الصید والذبائح، باب ما یکرہ من المثلۃ والمصبورۃ، صحیح مسلم، حوالہ سابق

گے۔ حضرت ابن عمرؓ کو دیکھا تو وہ سب منتشر ہو گئے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا: یہ کس نے کیا ہے؟ اللہ اور اس کے رسول نے ایسا کرنے والے پر لعنت کی ہے [۱]

اسی طرح کی ایک روایت حضرت انسؓ سے بھی مروی ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے کچھ لڑکوں کو دیکھا کہ ایک مرغی کو باندھ کر اس پر تیر اندازی کر رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا کرنے سے منع کیا ہے [۲]

و: باہم لڑانا:

قدیم زمانہ میں لوگوں کا دلچسپ مشغلہ رہا ہے کہ جانوروں کو آپس میں لڑایا جائے اور تماشا دیکھا جائے۔ اس کے شائقین آج کے دور میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ تماشا اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ دونوں جانور ہلکان نہ ہو جائیں اور ایک دوسرے کو لہولہان نہ کر دیں۔ ایسے مقابلے اسلام کی روح اور اس کے مزاج کے خلاف ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

نهى رسول الله ﷺ عن التحريش بين البهائم [۳]

رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کو آپس میں لڑانے سے منع فرمایا ہے۔

ز: بچے کو ماں سے جدا کرنا:

حیوانات کو کوئی تکلیف نہ پہنچے اس معاملے میں اسلام اس قدر حسّاس ہے کہ وہ اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ کسی حیوان کے چھوٹے بچے کو اس کی ماں سے جدا کر دیا جائے۔ ماں کو اپنے بچوں سے جو محبت ہوتی ہے وہ فطری ہے۔ بچوں کو جدا کرنے سے ماں پریشان ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ آپ قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس اثناء میں ہم نے (ایک گھونسلے میں) "حمّرہ" نامی ایک پرندہ اور اس کے دو بچے دیکھے۔ ہم نے بچوں

---

[۱] حوالہ سابق

[۲] حوالہ سابق

[۳] سنن ابی داود، کتاب الجہاد، باب فی التحریش بین البہائم، جامع ترمذی، ابواب الجہاد، باب ماجاء فی التحریش بین البہائم

کو لے لیا۔ یہ دیکھ کر وہ پرندہ منڈلانے اور پھڑ پھڑانے لگا۔ رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لائے تو فرمایا:

من فجع ھذہ بولدھا، ردّوا ولدھا الیھا[1]

اس پرندے کے بچوں کو لے کر کس نے اسے تکلیف پہنچائی ہے؟ انہیں واپس کر دو۔

ح: منھ پر مارنا یا داغنا:

چہرہ جسم کا نازک اور حساس حصہ ہوتا ہے۔ اس پر معمولی سی چوٹ سخت اذیت کا باعث ہوتی ہے۔ اسی طرح اس پر خراش یا زخم سے بدصورتی بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اسلام جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ لگانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسا کرنے سے سختی سے منع کیا ہے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں:

نھی رسول اللہ ﷺ عن الضرب فی الوجہ وعن الوسم فی الوجہ[2]

رسول اللہ ﷺ نے چہرہ پر مارنے اور چہرے پر داغنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت جابرؓ ہی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ ایک گدھے کے پاس سے گزرے۔ اس کے چہرہ کو داغا گیا تھا۔ اس پر آپؐ کی نظر پڑی تو آپؐ نے فرمایا:

لعن اللہ الذی وسمہ[3]

اللہ کی لعنت ہو اس شخص پر جس نے اسے داغا ہے۔

داغ لگانے اور نشان بنانے کی ضرورت پہچان کے لیے ہوتی ہے۔ اگر دوسری تدابیر سے ایسا ممکن نہ ہو اور نشان لگانا ضروری ہو تو چہرے کے علاوہ کسی ایسی جگہ نشان لگانا چاہیے جہاں تکلیف کم ہو اور نشان نمایاں رہے۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی بسا اوقات جانوروں پر نشان لگائے ہیں۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر میں اپنے بھائی کو لے کر آں حضرت ﷺ کی خدمت میں

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب کراہیۃ حرق العدو بالنار، وکتاب الأدب، باب فی قتل الذرّ، مسند احمد ۱/۴۰۴

[2] صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب النھی عن ضرب الحیوان فی وجہہ ووسمہ فیہ

[3] صحیح مسلم، حوالہ سابق

حاضر ہوا۔ اس وقت آپؐ ایک کھلیان میں بکریوں پر نشان لگا رہے تھے[1] ایک راوی شعبہ اپنے شیخ ہشام بن زید کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ غالباً انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ آں حضرت ﷺ بکریوں کے کانوں پر نشان لگا رہے تھے۔[2] حضرت انسؓ ایک دوسرے موقع کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں داغ لگانے کا آلہ ہے اور آپؐ صدقہ کے اونٹوں پر نشان لگا رہے ہیں۔[3]

اِشعار کی اجازت ہے:

جانوروں پر داغ لگانے کی ایک صورت ''اِشعار'' ہے۔ یہ صرف اونٹوں میں کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اونٹ کے کوہان میں ایک جانب شگاف دے دیا جائے جس سے خون بہنے لگے۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یہ قربانی کا جانور ہے۔[4]

اسلام سے پہلے عربوں میں قتل و غارت گری اور لوٹ مار عام تھی۔ بڑے بڑے قافلے اور جانوروں کے گلّے لوٹ لیے جاتے تھے۔ لیکن خانہ کعبہ، حج اور متعلقاتِ حج کو یہ لوگ عقیدت و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ کچھ مہینوں کو انہوں نے ''أشھُر حُرُم'' (محترم مہینے) قرار دے رکھا تھا۔ ان میں لوٹ مار نہیں کرتے تھے، تاکہ قافلے پُرامن طور پر حج کا سفر کر سکیں۔ اسی طرح یہ لوگ ان جانوروں سے بھی تعرض نہیں کرتے تھے جنہیں حج میں قربانی کے لیے خاص کر دیا گیا ہو۔ ایسے جانوروں کو 'ھَدْی' کہتے ہیں۔ ہدی کی پہچان کے لیے لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ ان کی گردنوں میں جوتوں کا قلادہ ڈال دیتے تھے اور ان کے کوہان چیر دیتے تھے جن سے خون بہتا رہتا تھا۔ ان علامتوں کو دیکھ کر لوگ ان جانوروں سے تعرض نہیں کرتے تھے۔

یہ علامتیں تمام عربوں میں معروف تھیں۔ اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ نے بھی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الصید والذبائح، باب العلم والوسم فی الصورۃ، صحیح مسلم، حوالہ سابق

[2] صحیح بخاری و صحیح مسلم، حوالہ سابق

[3] صحیح مسلم، حوالہ سابق

[4] النھایۃ فی غریب الحدیث، ابن الاثیر، المطبعۃ العثمانیۃ مصر، ۱۳۱۱ھ، ۲۲۴/۲، جامع الاصول فی احادیث الرسول، ابن الاثیر، دار المامون للتراث بیروت، ۳۴۰/۳

انہیں اختیار فرمایا۔ آپ نے قربانی کے جانوروں کی گردنوں میں قلادہ بھی پہنایا ہے اور ان کے کوہان میں شگاف بھی لگائے ہیں[1] لیکن آپ خون بہتا ہوا نہیں چھوڑ دیتے تھے، بلکہ شگاف دینے کے بعد بہنے والے خون کو صاف کر دیتے تھے۔[2]

اشعار کی شرعی حیثیت کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ مُثلہ کی ایک صورت ہے جس سے احادیث میں منع کیا گیا ہے۔ جمہور علماء، جن میں قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ بھی ہیں، اسے مستحب قرار دیتے ہیں، اس لیے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسا کیا ہے۔ امام طحاویؒ فرماتے ہیں:

''حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اختیار ہے، چاہے اِشعار کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا کہ یہ مستحب نہیں ہے، لیکن اسے مکروہ بھی نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ نبی ﷺ سے ایسا کرنا ثابت ہے۔[3]

امام طحاویؒ نے امام ابو حنیفہؒ کے قول کی تاویل و توجیہ کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''امام ابو حنیفہؒ نے اِشعار کو مطلق مکروہ نہیں قرار دیا ہے، بلکہ ان کے نزدیک کراہت اس طریقہ میں ہے جس سے زخم اتنا گہرا ہو جائے کہ جانور کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ خاص طور سے اس صورت میں جب شگاف نیزے سے لگایا جائے۔ چونکہ عوام اس سلسلے میں احتیاط نہیں کرتے تھے اس لیے امام ابو حنیفہؒ نے اسے مکروہ قرار دیا۔ لیکن جسے اس کا مسنون طریقہ معلوم ہو اس کے لیے مکروہ نہ ہوگا۔[4]

جانوروں پر لعنت بھیجنا منع ہے:

سواری یا بار برداری کے جانور کبھی اَڑ جاتے ہیں، یا تیز نہیں چلتے۔ ایسے مواقع پر ان کے مالکان انہیں بے تحاشا پیٹنے لگتے ہیں یا انہیں برا بھلا کہتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ رویّہ درست نہیں ہے۔ انہیں برا بھلا کہنے اور ان پر ڈنڈے برسانے کے بجائے یہ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحج، باب من اشعر وقلد، وباب اشعار البدن، صحیح مسلم، کتاب الحج، سنن ابوداود، کتاب المناسک، باب فی الاشعار

[2] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب تقلید الہدی واشعارہ

[3] فتح الباری، ابن حجر العسقلانی، دار المعرفۃ بیروت، ۵۴۴/۲

[4] فتح الباری، حوالہ سابق

دیکھنا چاہیے کہ ان کا اَڑیل پن کس وجہ سے ہے؟ اور ان کے ساتھ سہولت اور نرمی سے پیش آنا چاہیے۔

حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سفر میں تھے۔ ایک اونٹنی پر ایک انصاری عورت سوار تھی۔ راستے میں ایک موقع پر وہ اونٹنی اَڑ گئی تو وہ عورت اس پر لعنت کرنے لگی۔ رسول اللہ ﷺ تک اس کی آواز پہنچی تو آپؐ نے فرمایا ''اس اونٹنی پر جو سامان ہے اسے اتار لو اور اسے چھوڑ دو، کیوں کہ وہ لعنت زدہ ہے (ہمارے ساتھ نہیں جا سکتی) حضرت عمرانؓ فرماتے ہیں: اس اونٹنی کو چھوڑ دیا گیا، وہ گھومتی پھرتی تھی، کوئی اس سے تعرض نہیں کرتا تھا۔[1] حضرت ابو برزہ اسلمیؓ اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ اونٹنی پر سوار لونڈی نے اس پر لعنت کی تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ ''ہمارے ساتھ کوئی ایسی اونٹنی نہیں رہ سکتی جس پر لعنت ہو''[2]

حضرت عائشہؓ ایک اونٹنی پر سوار ہوئیں۔ وہ سدھی ہوئی نہیں تھی۔ جب اس نے چلنے میں کوتاہی کی تو اسے سخت سست کہنے لگیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''علیکِ بالرفق'' (نرمی اختیار کرو)[3]

دوسری روایت میں کچھ تفصیل ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آں حضرت ﷺ نے ایک مرتبہ میرے ساتھ صحراء کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ آپ نے میرے پاس صدقہ کے اونٹوں میں سے ایک ایسی اونٹنی بھیجی جسے اب تک سواری کے لیے نہیں استعمال کیا گیا تھا اور فرمایا:

یا عائشة، أرفقی فان الرفق لم یکن فی شیء قطّ الا زانه، ولا نُزع من شیءٍ الا شانه[4]

اے عائشہ نرمی اختیار کرو۔ جس چیز میں نرمی ہو وہ خوب صورت ہو جاتی ہے اور جس چیز سے نرمی نکل جائے وہ بدنما بن جاتی ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب النہی عن لعن الدواب وغیرھا

[2] حوالہ سابق

[3] حوالہ سابق، باب فضل الرفق

[4] سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب ماجاء فی الہجرۃ، وکتاب الادب، باب فی الرفق

رزین کی روایت میں یہ بھی صراحت ہے کہ آپ نے نرمی کی یہ ہدایت کیوں فرمائی تھی؟ اس میں حضرت عائشہؓ ہی کی زبانی مذکور ہے کہ وہ اونٹنی چل نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے برا بھلا کہا، تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

مهلاً يا عائشة، ان اللّٰه يحبّ الرفق في الأمر كلّه، فعليكِ بالرفق[1]

اے عائشہ ٹھہرو۔ اللہ ہر معاملے میں نرمی پسند کرتا ہے۔ نرمی اختیار کرو۔

بے ضرر جانوروں کو مارنے کی ممانعت:

جو حیوانات انسانوں کو کوئی ضرر نہیں پہنچاتے، یا ان سے کوئی منفعت وابستہ ہے، ان کو مارنے سے احادیث میں منع کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے چار حیوانوں کو مارنے سے منع فرمایا ہے: چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد''۔[2]

اس کی تشریح میں امام خطابیؒ فرماتے ہیں: ''چیونٹی کو مارنے سے منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بے ضرر جانور ہے۔ شہد کی مکھی کو مارنے سے اس لیے منع کیا گیا ہے کیوں کہ اس سے شہد حاصل ہوتا ہے۔ رہے ہدہد اور صرد تو ان کو مارنے کی ممانعت سے اشارہ ملتا ہے کہ ان کا گوشت حرام ہے''۔[3]

ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک پیغمبر کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا۔ انہوں نے اس جگہ چیونٹیوں کے پورے گھر کو جلا دینے کا حکم دے دیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ اگر تمہیں ایک چیونٹی نے کاٹا تھا تو صرف اسی کو مارتے۔ تم نے ایک مخلوق کو، جو اللہ کی تسبیح کرتی ہے، کیوں نذرِ آتش کر دیا؟''[4]

---

[1] بحوالہ سابق، جامع الاصول، ابن الاثیر، ۵۳۳/۴

[2] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی قتل الذر، سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، باب ما ینہی عن قتلہ، مسند احمد ۳۳۲/۱۔ ۳۴۷

[3] معالم السنن، خطابی، المطبعۃ العلمیۃ حلب، ۱۹۳۴ء، ۱۵۷/۴

[4] صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب اذا احرق المشرک المسلم ہل یحرق، صحیح مسلم کتاب السلام، باب النہی عن قتل النمل

بعض احادیث میں مینڈک کو مارنے سے منع کیا گیا ہے۔ ایک طبیب نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا وہ مینڈک مار کر اسے دوا میں شامل کرسکتا ہے؟ آپ نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔[1] شارحینِ حدیث نے اس ممانعت کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس کا کھانا حرام ہے اور آں حضرتؐ نے کھانے کے علاوہ کسی اور مقصد سے جانور کو ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے۔[2]

ضرر رساں حیوانات کو مارنے کا حکم:

احادیث میں بعض حیوانات کو مارنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ وہ حیوانات ہیں جو انسانوں کو ضرر پہنچانے والے ہیں۔

سانپ کی ضرر رسانی معروف ہے۔ بعض سانپ اتنے زہریلے ہوتے ہیں کہ ان کے ڈسنے سے انسان فوراً مر جاتا ہے اور اس کے علاج معالجہ کی بھی مہلت نہیں ملتی۔ اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں مارنے کا حکم دیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

من ترک الحیّات مخافةَ طلبِهنَّ فلیس منّا [3]

جس شخص نے سانپوں کو مارنے سے اس اندیشہ سے گریز کیا کہ وہ اس سے انتقام لے لیں گے وہ ہم میں سے نہیں۔

دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أقتلوا الحیّات وذاالطفیتین والأبتر [4]

سانپوں کو مارو، خاص طور سے اس سانپ کو جس کی پیٹھ پر دو دھاریاں ہوتی ہیں اور چھوٹی دم والے سانپ کو۔

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب فی الادویۃ المکروہۃ، سنن النسائی، کتاب الصید، باب الضفدع

[2] معالم السنن، ۴/۲۲۲، مزید ملاحظہ کیجیے ”صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات“، سید جلال الدین عمری، ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ، طبع ۱۹۹۴ء، ص: ۲۸۰۔۲۸۱۔ مولانا عمری نے طبی تجربات کے لیے مینڈک کی چیر پھاڑ کو جائز اور حدیث میں مذکور ممانعت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

[3] سنن ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی قتل الحیات

[4] صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرہا

امام زہریؒ فرماتے ہیں: ''ہمارا خیال ہے کہ خاص طور پر دو سانپوں کا تذکرہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں بہت زہریلے ہوتے ہیں'' [۱]

آں حضرت ﷺ کا یہ حکم اپنے عموم پر نہیں ہے، اس کی تائید بعض روایات سے ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، جو مذکورہ بالا حدیث کے راوی ہیں، اس کا عام مفہوم مراد لیتے تھے۔ اسی لیے وہ جہاں کہیں کوئی سانپ دیکھتے، مار دیتے تھے۔ حضرت ابولبابہؓ اور حضرت زید بن الخطابؓ نے انہیں بتایا کہ یہ حکم عام نہیں ہے۔ آں حضرت ﷺ نے گھروں میں پائے جانے والے سانپوں کو مارنے کی ممانعت کی ہے۔ [۲]

بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ تخصیص بعض اسباب سے صرف مدینہ کے لیے تھی۔ دیگر علاقوں میں گھروں کے سانپوں کو بھی مارا جائے گا۔ [۳]

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں ''ایک سانپ جو پتلا ہوتا ہے، اس کا رنگ چاندی کی طرح ہوتا ہے اور وہ لہرا کر نہیں چلتا، اسے نہیں مارنا چاہیے''۔ [۴]

آج کل کی تحقیق یہ ہے کہ سانپوں کی بے شمار قسمیں ہیں۔ ان میں سے صرف چند ہی زہریلے اور جان لیوا ہوتے ہیں۔ انسان بالعموم دہشت سے مر جاتا ہے۔ بہر حال جن سانپوں کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہو کہ وہ زہریلے نہیں ہیں، انہیں نہیں مارا جائے گا۔ مارنے کا حکم صرف ان سانپوں کے لیے ہے جن کے زہریلے ہونے کا اندیشہ ہو، اور اس کی مصلحت یہ ہے کہ انسان ان کی زہرناکی اور شر سے محفوظ ہو جائیں۔

حضرت عبداللہ (بن مسعودؓ) بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ نبی ﷺ کے ساتھ ایک غار میں تھے کہ اچانک ایک سانپ نکل آیا۔ آپؐ نے فرمایا: اسے مارو، لیکن اس سے پہلے کہ ہم اسے مار پاتے، وہ ایک بل میں گھس گیا۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا:

---

[۱] صحیح مسلم، حوالہ سابق

[۲] حوالہ سابق

[۳] شرح النووی علی صحیح مسلم، اصح المطابع دہلی، ۲/ ۲۳۴

[۴] جامع ترمذی، ابواب الصید، باب قتل الحیات

وقاها الله شرّکم کما وقاکم شرّها [۱]

اللہ نے اسے تمہارے شر سے محفوظ رکھا جس طرح تمہیں اس کے شر سے محفوظ رکھا۔

احادیث میں کتوں کو بھی مارنے کا تذکرہ ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ کا عام حکم تھا:

عن عبد الله بن عمر أن رسول الله ﷺ أمر بقتل الكلاب [۲]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتوں کو مارنے کا حکم دیا ہے۔

لیکن بعض دیگر روایات صریح ہیں کہ بعد میں اس کی حیثیت عام حکم کی نہیں رہی۔ حضرت عبداللہ بن مغفلؓ بیان کرتے ہیں:

أمر رسول الله ﷺ بقتل الكلاب، ثم قال: مابالهم وبال الكلاب [۳]

رسول اللہ ﷺ نے کتوں کو مارنے کا حکم دیا، لیکن پھر فرمایا: انہیں مارنے کی کیا ضرورت ہے۔

انہی صحابی سے مروی ایک دوسری حدیث کے الفاظ کچھ مختلف ہیں۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لو لا أن الكلاب أمّة من الأمم لأمرت بقتلها كلّها، فاقتلوا منها كلّ أسود بهيم [۴]

اگر کتے بھی ایک مخلوق نہ ہوتے تو میں سب کو مار دینے کا حکم دے دیتا۔ لہٰذا صرف ان کتوں کو مارو جو کالے بھجنگ ہوں۔

بعض احادیث میں کتے پالنے سے منع کیا گیا ہے اور صرف مخصوص حالات میں مثلاً شکار، ریوڑ اور کھیتی کی نگرانی کے لیے انہیں پالنے کی اجازت دی گئی ہے۔[۵] اسی طرح

---

[۱] صحیح مسلم، حوالہ سابق

[۲] موطا امام مالک، کتاب الاستیذان، باب ماجاء فی امر الکلاب، صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، صحیح مسلم، کتاب المساقاة والمزارعة، باب الامر بقتل الکلاب

[۳] صحیح مسلم، حوالہ سابق

[۴] جامع ترمذی، ابواب الصید، باب فی قتل الکلاب

[۵] جامع ترمذی، ابواب الصید، باب من امسک کلبا ما ینقص من اجره

کتا اگر کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اس برتن کو پاک کرنے کے لیے سات مرتبہ خوب اچھی طرح دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔ [1]

کتا ایک وفادار جانور ہے۔ اس سے بہت سے کام لیے جاتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر اس کے بارے میں یہ اسلامی احکام بظاہر سخت اور ناروا معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے پہنچنے والے ممکنہ خطرات کا علم ہو تو یہی احکام عین قرینِ مصلحت دکھائی دیں گے۔

کتے سے انسانوں کو لاحق ہونے والی متعدّد مہلک بیماریاں ہیں۔ ایک بیماری کو 'داء الکلب' (Rabies) کہتے ہیں۔ پاگل کتّے کے لعاب میں خاص طرح کے جراثیم ہوتے ہیں جنہیں Rabies virus کہا جاتا ہے۔ یہ جراثیم کتے کے کاٹنے سے یا زخم پر اس کا لعاب لگ جانے سے جسمِ انسانی میں داخل ہوتے ہیں اور اعصاب کو شدید متاثر کرتے ہیں، جس سے سخت قسم کا تشنج پیدا ہوتا ہے، بلا ارادہ عجیب وغریب حرکتیں سرزد ہونے لگتی ہیں، انسان پانی سے خوف کھاتا ہے۔ یہ علامتیں نمایاں ہونے کے بعد کم ہی مریض صحت یاب ہو پاتے ہیں۔ ایک دوسری بیماری Hydatodiasis ہے۔ یہ ایک طفیلیہ سے پھیلتی ہے جسے Tape worm کہتے ہیں۔ یہ طفیلیہ کتے کی آنتوں میں پلتا ہے۔ اس کے انڈے اور جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کتے کی اجابت کے ساتھ خارج ہوتے ہیں اور اس کے سارے جسم پر پھیل جاتے ہیں۔ کتّے کو چھونے اور اس سے خلا ملا رکھنے سے وہ انسان تک منتقل ہوتے ہیں اور مختلف ذرائع سے انسان کی آنتوں، جگر، پھیپھڑے، دماغ اور دیگر اعضاء میں پہنچ کر اپنے گرد خول (Cyst) بنا لیتے ہیں اور بڑھتے ہیں۔ ان کے دباؤ سے متاثرہ عضو بالکل ناکارہ ہو جاتا ہے۔ [2]

بعض احادیث میں چند دیگر جانوروں کو مارنے کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خمس من الدواب، من قتلهن وهو محرم فلا جناح عليه : العقرب والفأره والكلب العقور والغراب والحداة [3]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الوضو، باب اذا شرب الکلب فی الاناء۔ یہ حدیث دیگر کتب حدیث میں بھی مروی ہے۔

[2] ملاحظہ کیجیے تذکرہ حیوانات قرآن کریم میں، ڈاکٹر میر گوہر علی خاں، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی طبع اول ۱۹۹۸ء، ص: ۸۲۔۸۴

[3] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا وقع الذباب...... الخ

پانچ جانور ایسے ہیں کہ اگر انہیں کوئی حالتِ احرام میں بھی مار دے تو کوئی حرج نہیں۔ وہ ہیں: بچھو، چوہیا، کاٹنے والا کتا، کوا اور چیل۔

ایک حدیث میں گرگٹ کو مارنے کا حکم دیا گیا ہے۔[1] ماہرینِ علم الحیوانات نے صراحت کی ہے کہ گرگٹ کا شمار موذی حیوانات میں ہوتا ہے۔[2]

ان جانوروں کو مارنے کا حکم ان سے لاحق ہونے والے ضرر کی وجہ سے ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی انہیں مارنا اپنا مشن بنا لے۔ بلکہ ان سے سابقہ پیش آئے اور وہ ضرر پہنچا رہے ہوں یا اس کا اندیشہ ہو تو انہیں مار دیا جائے، کہ اسی طرح ان سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

موذی جانوروں کو مارنا بے رحمی نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو انسانی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ اگر انسانی آبادی کو محفوظ رکھنا ہے تو لامحالہ اس کو ضرر پہنچانے والی چیزوں سے بچانے کی موثر تدبیر بھی کرنی ہوگی۔

حقوقِ حیوانات کے سلسلے میں اسلام کی یہ تعلیمات مثالی ہیں۔ حیوانات پر ہونے والے مظالم کے خلاف برپا ہونے والی تحریکات (Anti cruelty movements) سے صدیوں پہلے انہیں پیش کیا گیا تھا۔ اسلامی معاشرہ ہر دور میں ان پر بڑی حد تک عامل رہا ہے۔ اسی لیے وہاں کبھی ایسی صورتِ حال پیدا نہیں ہوئی جس کے ردّ عمل میں مغرب کے مثل تحفظِ حیوانات کی تحریکیں چلانے کی نوبت آئے۔

☆ ☆ ☆

---

[1] صحیح بخاری، حوالہ سابق، صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات، باب استحباب قتل الوزغ

[2] حیوٰۃ الحیوان الکبریٰ، شیخ کمال الدین دمیری، دار القاموس الحدیث، ۲/۳۴۸

گوشت خوری

قرآن کریم میں حیوانات سے حاصل ہونے والے جو مختلف فائدے بیان کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان سے انسانوں کی غذائی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اس چیز کو بندوں پر اللہ تعالیٰ کے احسانات کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے:

اللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْکَبُوا مِنْهَاوَمِنْهَا تَاکُلُون (المومن: ۷۹)

اللہ ہی نے تمہارے لیے یہ مویشی جانور بنائے ہیں، تا کہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ۔

سورۂ نحل میں سمندر سے (مچھلیوں کی شکل میں) حاصل ہونے والے تازہ گوشت کا تذکرہ ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ البَحْرَ لِتَاکُلُوا مِنْهُ لَحْماً طَرِیّاً (النحل: ۱۴)

وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تا کہ تم اس سے تر و تازہ گوشت لے کر کھاؤ۔

ان غذاؤں کو قرآن حلال اور پاکیزہ قرار دیتا ہے اور ان پر اللہ کا شکر بجالانے کی تاکید کرتا ہے:

فَکُلُوا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰهُ حَلاَلاً طَیِّباً وَاشْکُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُون (النحل: ۱۱۴)

پس اے لوگو، اللہ نے جو کچھ حلال اور پاک رزق تم کو بخشا ہے اسے کھاؤ اور اللہ کے احسان کا شکر ادا کرو اگر تم واقعی اسی کی بندگی کرنے والے ہو۔

گوشت خوری پر اعتراض:

اسلام کی اس اجازت پر بعض حضرات سخت اعتراض کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک

یہ بے رحمی اور ظلم ہے۔ بعض غیر متعصب حضرات اگرچہ اسلام کی بعض دیگر تعلیمات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں، مگر یہ مسئلہ ان میں تنفر پیدا کر دیتا ہے۔ اگر ان کے سامنے حیوانات کا خیال رکھنے اور انہیں اذیت نہ پہنچانے کی اسلامی تعلیمات پیش کی جائیں تو کہتے ہیں کہ ان کی جان لینے اور ان کا گوشت کھانے سے بڑا ظلم اور کیا ہوسکتا ہے۔

اس سلسلے میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ تمام کے تمام جذباتی نوعیت کے ہیں۔ انہیں عقل و منطق کی تائید حاصل ہے نہ وہ اپنے پیچھے دلائل کی قوت رکھتے ہیں۔

''اہنسا'' کا نظریہ:

اس سلسلے میں ایک بات بہت زور و شور سے کہی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ جیو ہتیا پاپ ہے۔ کسی بھی جاندار مخلوق کو، خواہ وہ انسان ہو یا حیوان، تکلیف پہنچانے سے بچنا چاہیے۔ یہ نظریہ ''اہنسا'' کہلاتا ہے۔ بظاہر یہ جتنا خوش نما معلوم ہوتا ہے، حقیقت کی دنیا میں اتنا ہی ناقابلِ عمل ہے۔

اس کائنات کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ دوسرے جانداروں کو تکلیف پہنچائے یا ہلاک کیے بغیر انسانی زندگی کی بقا کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس فضائے بسیط میں لاتعداد جراثیم ہیں جو ہوا، پانی اور غذا میں شامل رہتے ہیں۔ فضا میں سانس لے کر، پانی پی کر اور غذا استعمال کر کے ہم ہر آن ان کی بڑی تعداد کو ہلاک کرتے رہتے ہیں۔ دودھ جو ایک فرحت بخش غذا ہے، اس میں بے شمار جراثیم ہوتے ہیں۔ آگ پر گرم کرنے سے یہ سب ہلاک ہوجاتے ہیں۔ شہد کی مکھیوں سے شہد انہیں تکلیف پہنچائے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ حفظانِ صحت اور وبائی امراض سے بچاؤ کے لیے جراثیم پھیلانے والے کیڑے مکوڑوں کو مارنے کی تدابیر اختیار کرنی ضروری ہے۔ بہت سے امراض کا سبب مخصوص قسم کے جراثیم ہیں۔ ان سے نجات پانے کے لیے ایسی دوائیں ایجاد کی گئی ہیں جو ان جراثیم کو ہلاک کر دیتی ہیں۔ درندوں، موذی جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں کو چھوٹ دے دی جائے اور ان سے کچھ تعرض نہ کیا جائے تو انسانی زندگی اجیرن ہوجائے، فصلیں تباہ ہوجائیں اور انسانی ضروریات کی دیگر چیزیں برباد ہوجائیں۔

معلوم ہوا کہ انسانی زندگی کی بقا اور تحفظ کے لیے قدم قدم پر جاندار مخلوقات کی ہلاکت لازم آتی ہے اور اسے گوارا کیا جاتا ہے۔ پھر انسانوں کی غذائی ضروریات کے لیے جانوروں کو ذبح کرنے کی بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی جبکہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

نباتات میں بھی جان اور حس ہوتی ہے:

اہنسا کا نظریہ پیش کرنے اور جیو ہتیا کو پاپ قرار دینے والے گوشت خوری کو چھوڑ کر ساگ سبزیوں پر اکتفا کرنے کا مشورہ دیتے ہیں تو اس سے لگتا ہے کہ وہ نباتات کو بے جان سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ جدید سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں اب یہ بات پائے ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ حیوانات کی طرح نباتات بھی جاندار مخلوق ہیں، کیوں کہ تمام جان دار اشیاء ایک ہی مادہ سے بنی ہیں جسے اصطلاح میں ’’مادۂ حیات‘‘ (Protoplasm) کہتے ہیں اور نباتات بھی اسی سے وجود میں آئے ہیں۔ جان دار ہونے کی ایک علامت احساس وشعور ہے اور سائنسی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ نباتات بھی احساس رکھتے ہیں۔ کسی خوش گوار واقعہ پر خوشی اور ناخوش گوار واقعہ پر رنج والم کا اظہار کرتے ہیں۔ دوا کے اثر سے بے ہوش ہوجاتے ہیں اور کوئی زہر ان کی جڑوں میں ڈال دیا جائے تو مرجھا جاتے ہیں۔ بعض پودوں مثلاً لاجونتی میں احساس کی یہ کیفیت بہت نمایاں ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا نام ہی حساس پودہ Sensitive Plant رکھ دیا گیا ہے۔

اس تحقیق کا سہرا ایک ہندوستانی سائنس داں آچاریہ جگدیش چندر بوس کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے نباتات پر اپنی تحقیقات کے ذریعے ثابت کیا کہ وہ بھی حیوانات کی طرح جان دار ہیں۔ دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ انہوں نے نباتات کے احساسات کو ریکارڈ کرنے کے لیے ایک آلہ ایجاد کیا۔ اس آلہ کے ذریعہ انہوں نے یہ دکھایا کہ نباتات بھی دوسری جاندار چیزوں کی طرح دکھ سکھ کا احساس رکھتے ہیں۔ ان کی اس تحقیق کے نتیجے میں سائنس کی دنیا میں یہ بات تسلیم کی جانے لگی کہ نباتات اور حیوانات میں ایک ہی طرح کی جان ہے۔

بلا ضرورت جانور کو ہلاک کرنا ممنوع ہے:

کہا جاتا ہے کہ جانور کو ذبح کرتے وقت اسے تکلیف ہوتی ہے۔ اس تکلیف کی پروانہ کرنا بے رحمی اور سنگ دلی ہے۔ رحم دلی کا یہ تصور خود ساختہ ہے۔ پھوڑے پر ڈاکٹر نشتر لگاتا ہے تو مریض کو تکلیف ہوتی ہے۔ جنگ کے موقع پر دشمن کو بے دریغ قتل کیا جاتا ہے۔ کوئی کسی کو قتل کردے تو بدلے میں اس کی جان لینے کو قانوناً روا رکھا گیا ہے۔ ان صورتوں میں لاحق ہونے والی تکلیف اور ضائع ہونے والی جان کو بے رحمی نہیں کہا جاتا۔ اس لیے کہ یہ کام ایک مقصد سے انجام دیے جاتے ہیں اور ان سے انسانیت کا مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی بات جانوروں کے ذبیحے کے سلسلے میں کہی جائے گی۔ اسلام نے جانوروں کو ذبح کرنے کی اجازت انسانوں کی غذائی ضرورت کی تکمیل کے لیے دی ہے۔ اس نے بلا ضرورت جانوروں کو ہلاک کرنے سے سختی سے منع کیا ہے اور اس پر سخت وعید سنائی ہے۔ ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین قسم کے لوگوں کو سب سے بڑا گناہ گار قرار دیا ہے۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو کسی چوپایے کو بلا ضرورت ہلاک کرتا ہے (ورجل يقتل دابّة عبثاً)[1]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من قتل عصفوراً فما فوقها بغير حقّها سأل الله عزوجل عنها يوم القيامة

جس شخص نے کسی گوریا یا اس سے بڑے جانور کو ناحق مارا تو قیامت کے دن اللہ تعالی اس سے باز پرس کرے گا۔

صحابہ نے عرض کیا: حق سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

حقّها أن تذبحها فتأكلها، ولا تقطع رأسها فيرمي بها[2]

اس کا حق یہ ہے کہ تم اسے ذبح کر کے کھاؤ۔ اس کا سر کاٹ کر پھینک نہ دو۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت شریدؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اللہ کے

---

[1] مستدرک حاکم، کتاب النکاح، باب اعظم الذنوب عند اللہ

[2] سنن النسائی، کتاب الأضاحی، باب من قتل عصفورا بغیر حقھا، (علامہ البانیؒ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے) سنن الدارمی، کتاب الاضاحی، باب من قتل شیئا من الدواب عبثاً

رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

من قتل عصفوراً عبثاً عجّ الی اللہ عزوجل یوم القیامۃ، یقول: یا رب ان فلانا قتلنی عبثاً ولم یقتلنی لمنفعۃ[۱]

جس شخص نے کسی گوریا کو بلاضرورت مارا تو وہ قیامت کے دن اللہ عزوجل کی بارگاہ میں اس شخص کے سلسلے میں فریاد کرے گی کہ اے میرے رب، اس نے مجھے بلاضرورت مارا، مجھے مارنے میں اس کی کوئی منفعت وابستہ نہیں تھی۔

ذبح کرنے میں رحم دلی کا مظاہرہ:

مذکورہ بالا سبب سے اسلام نے حیوانات کو ذبح کرنے کی اجازت دی ہے، لیکن ساتھ ہی اس نے ایسی ہدایات دی ہیں جن سے انہیں کم سے کم تکلیف کا احساس ہو، مثلاً:

۱۔ اس نے حکم دیا کہ ذبح کے لیے ایسا آلہ استعمال کیا جائے جو دھار دار ہو، تاکہ رگیں اچھی طرح کٹ جائیں اور خون بہہ جائے۔ ایک موقع پر اللہ کے رسول ﷺ سے ایک صحابی نے دریافت کیا کہ اگر ہمارے پاس چھری نہ ہو تو کیا ہم بانس سے ذبح کر سکتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہر اس چیز سے ذبح کیا جا سکتا ہے جس سے خون بہہ جائے، البتہ دانت اور ناخن سے نہیں"[۱] اس ممانعت کی حکمت یہی ہے کہ ان چیزوں سے اور ان جیسی دیگر چیزوں سے عمل ذبح آسانی سے نہیں انجام پاتا۔

۲۔ یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ چھری کو خوب تیز کر لیا جائے، تاکہ ذبح کرنے میں کم سے کم وقت لگے۔ حضرت شداد بن اوسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اذا ذبحتم فأحسنوا الذبح، ولیحدّ أحدکم شفرتہ، ولیرح ذبیحتہ[۲]

جب ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو۔ چھری کو خوب تیز کر لینا چاہیے تاکہ جانور کو تکلیف نہ ہو۔

۳۔ اسلام اس معاملے میں اتنا حساس ہے کہ وہ یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ چھری تیز کرنے کا عمل جانور کی نگاہوں کے سامنے ہو۔ حضرت سالمؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت

---

[۱] سنن النسائی، حوالہ سابق

[۲] صحیح مسلم، کتاب الصید، باب الامر باحسان الذبح والقتل، یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی میں بھی ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا:

أمر رسول الله ﷺ بحدّ الشفار، وأن تواری عن البهائم [1]

رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ چھریوں کو تیز کرلیا جائے اور ذبح کرنے سے پہلے انہیں جانوروں سے چھپا کر رکھا جائے۔

۴۔ آں حضرت ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ پہلے جانور کو ذبح کرنے کے لیے زمین پر گرادیا جائے پھر چھری تیز کی جائے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک بکری کو ذبح کرنے کے لیے زمین پر لٹا دیا، پھر چھری تیز کرنے لگا۔ آں حضرت ﷺ نے دیکھا تو فرمایا:

أتريد أن تميتها موتات؟ هلاّ حددت شفرتک قبل أن تضجعها [2]

کیا تم اسے کئی موتیں مارنا چاہتے ہو؟ اسے لٹانے سے پہلے تم نے چھری کیوں نہیں تیز کرلی؟

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ پہلے اس نے ایک بکری ذبح کرنے کے لیے پکڑی، پھر چھری تیز کرنے لگا۔ انہوں نے اسے ایک کوڑا مارا اور فرمایا: جاندار کو تکلیف پہنچاتے ہو، اسے پکڑنے سے پہلے چھری کیوں تیز نہیں کرلی؟ [3]

۵۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی بھی ممانعت فرمائی ہے کہ جانور کو ادھورا ذبح کرکے چھوڑ دیا جائے اور وہ تڑپ تڑپ کر جان دے دے۔ اسے آپ نے شیطانی عمل قرار دیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ دونوں سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا تأكل الشريطة فإنها ذبيحة الشيطان [4]

'شریطہ' نہ کھاؤ، اس لیے کہ وہ شیطان کا ذبیحہ ہے۔

''**شریطہ**'' سے مراد وہ ذبیحہ ہے جس کی گردن پر اتنی ہلکی چھری چلائی جائے کہ

---

[1] سنن ابن ماجہ، ابواب الذبائح، باب اذا ذبحتم فاحسنوا الذبح

[2] مستدرک حاکم، کتاب الاضاحی، لتحد الشفرۃ قبل اضجاع الاضحیۃ

[3] السنن الکبری للبیہقی، کتاب الضحایا، باب الذکاۃ بالحدید، ۹/۲۸۰۔۲۸۱

[4] مسند احمد، ۱/۲۸۹، سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، باب فی المبالغۃ فی الذبح

بس کھال کٹے۔ نہ رگیں کٹیں، نہ قاعدے سے خون بہے۔ پھر جانور کو چھوڑ دیا جائے، یہاں تک کہ وہ مر جائے؟ یہ اہلِ جاہلیت کا طریقہ تھا۔ ایسا کرنے سے ان کے نزدیک وہ حلال ہو جاتا تھا۔ اس کی نسبت شیطان کی طرف اس لیے کی گئی ہے، کیوں کہ شیطان ہی نے انہیں اس پر اکسایا تھا اور اسے خوش نما بنا کر پیش کیا تھا۔ [۱]

۶۔ ذبح کرتے وقت جانور کے ساتھ رحم دلی اور نرمی کا اس حد تک خیال رکھا گیا ہے کہ اسے بے دردی کے ساتھ کھینچ کر لے جانے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو دیکھا کہ وہ بکری کو ذبح کرنے کے لیے گھسیٹ کر لے جا رہا ہے۔ انہوں نے اسے ایک کوڑا لگایا اور فرمایا: ’’تیرا برا ہو، اسے موت کی طرف صحیح طریقے سے لے جاؤ‘‘ [۲]

کیا گوشت خوری سے بے رحمی اور خوں خواری پیدا ہوتی ہے؟:

گوشت خوری کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ اس سے انسان میں حیوانی خصوصیات ابھرتی ہیں اور بے رحمی اور خوں خواری پیدا ہوتی ہے، جب کہ سبزی خوری سے ایسا نہیں ہوتا۔ یہ بات سائنٹفک طور پر صحیح ہے نہ تاریخ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ پیچھے بیان کیا گیا کہ حیوانات اور نباتات دونوں ایک ہی مادے سے وجود میں آتے اور نشو نما پاتے ہیں، جسے پروٹو پلازم کہتے ہیں۔ اس لیے دونوں میں حیاتیاتی اور کیمیاوی اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک ہی مادے سے بنی ہوئی دو چیزوں میں سے ایک کے استعمال سے انسان میں بے رحمی پیدا ہو اور دوسری میں یہ تاثیر نہ پائی جاتی ہو۔ تاریخ میں گوتم بدھ اور حضرت عیسیٰؑ کی اخلاقی تعلیمات عالمی شہرت رکھتی ہیں۔ انہوں نے رحم، محبت، ہمدردی اور مواسات کا درس دیا ہے، حالاں کہ دونوں گوشت خور تھے، جب کہ سبزی خور ہونے کے باوجود ہٹلر کے ظلم و ستم اور اس کی سفاکیوں کی داستانیں زبان زد ہیں۔

---

[۱] سنن ابوداؤد، حوالہ سابق

[۲] سنن بیہقی، کتاب الضحایا، باب الذکاۃ بالحدید...... ۲۸۱/۹

ناکارہ مویشیوں کے اضافی بوجھ سے نجات:

گوشت خوری کو ممنوع قرار دینے سے بہت سے تمدنی اور معاشی مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بہت سے جانور کسی بیماری یا حادثہ کی وجہ سے معذور ہو جاتے ہیں۔ وہ بار برداری کے قابل رہتے ہیں نہ ان سے زراعت میں کوئی کام لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح دودھ دینے والے جانور بھی بعض اسباب سے دودھ دینا بند کر دیتے ہیں اور کسی مصرف کے نہیں رہتے۔ گوشت خوری پر پابندی سے لازم آتا ہے کہ ان ناکارہ جانوروں کے مالکان ان کا اضافی بوجھ اس وقت تک برداشت کرتے رہیں جب تک کہ وہ اپنی موت نہ مر جائیں، یا انہیں آوارہ چھوڑ دیں۔ ایسے جانور سڑکوں پر ادھر ادھر مارے پھرتے ہیں اور ردّی کاغذ کے ٹکڑے، گندے چیتھڑے اور پولیتھین کی تھیلیاں کھانے پر مجبور ہوتے ہیں، یا کھیتوں کی طرف رخ کرتے ہیں اور فصلوں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ ایسے جانوروں کے لیے حکومتی سطح پر کچھ انتظامات کیے گئے ہیں، لیکن کروڑوں ناکارہ مویشیوں کو دیکھتے ہوئے یہ سرکاری انتظامات انتہائی ناکافی ہیں اور ان کے لیے بھی حکومت کو خطیر مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

ناکارہ مویشیوں کے اس پیچیدہ مسئلہ کا اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے کہ انہیں ذبح کرکے ان کا گوشت استعمال کیا جائے۔ اس سے ایک طرف ان کے اضافی بار سے نجات ملے گی تو دوسری طرف ان کے چمڑے، ہڈی اور دیگر اجزاء کو کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اسلام نے گوشت خوری کی اجازت دے کر اس مسئلہ کو بخوبی حل کیا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے کہ حیوانات جب تنومند ہوں تبھی ان سے سواری اور بار برداری کے کام لیے جائیں اور تبھی ان کا گوشت استعمال کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ انتہائی لاغر اور کمزور ہو جائیں تب ان کے مالک انہیں ناکارہ سمجھ کر ان کے چارہ پانی سے بے پرواہ ہو جائیں۔ حضرت سہل بن الحنظلیہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک اونٹ کے پاس سے ہوا۔ وہ اس قدر نحیف و لاغر تھا کہ اس کا پیٹ پیٹھ سے جا ملا تھا۔ اسے دیکھ کر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

اتقوا الله فی هذه البهائم المعجمة فار کبو ها صالحة و کلو ها صالحة[1]

ان جانوروں کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ جب وہ ٹھیک حالت میں ہوں تب ہی ان پر سواری کرو اور تبھی ان کا گوشت کھاؤ۔

دودھ دینے والے جانور جب تک دودھ دیتے رہیں، انہیں ذبح کرنے سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ ایک انصاری صحابی کے گھر تشریف لے گئے۔ دوسری روایت میں ان صحابی کا نام واقفیؓ مذکور ہے۔ اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ اس موقع پر رسول اکرم ﷺ اپنے ساتھ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بھی لے گئے تھے۔ ان حضرات کو دیکھ کر وہ صحابی بہت خوش ہوئے۔ انہیں مرحبا کہا۔ پھر چھری ہاتھ میں لی اور بکریوں کے ریوڑ میں جا کر دیکھنے لگے کہ ان کی خاطر تواضع کے لیے کون سی بکری ذبح کریں۔ آپؐ نے دیکھا تو فرمایا:

ایاک و الحلوب[2] (دودھاری مت ذبح کرنا)

حضرت ابن عباسؓ ایک دوسرا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت ابوالہیثم بن التیہانؓ سے دعوت کرنے کی فرمائش کی۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

ایاک و الحلوب، اذبح لنا عناقا[3]

دودھاری بکری نہ ذبح کرنا، ہمارے لیے بکری کا بچہ ذبح کرو۔

حضرت علیؓ بھی بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے دودھ دینے والے جانوروں کو ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے۔[4]

اس سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ دودھ دینے والے جانور دودھ دینا بند کر دیں تو انہیں ذبح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اسلام میں جانوروں کا چمڑا استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور اس معاملے میں ذبیحہ ہونے کی بھی قید نہیں لگائی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے

---

[1] سنن ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب مایؤمر بہ من القیام علی الدواب والبہائم

[2] سنن ابن ماجہ، ابواب الذبائح، باب النھی عن ذبح ذوات الدرّ

[3] مستدرک، حاکم، کتاب الذبائح، النھی عن مثلۃ الحیوان

[4] مستدرک، حوالہ سابق

ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک جگہ سے ہوا۔ آپؐ نے وہاں ایک مردار بکری پڑی ہوئی دیکھی۔ آپؐ نے فرمایا: ’’تم لوگوں نے اس کے چمڑے سے کیوں فائدہ نہیں اٹھایا‘‘؟ صحابہ نے عرض کیا: ’’یہ مرگئی تھی‘‘۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ’’مردار کا صرف گوشت کھانا حرام ہے۔‘‘[1]

گوشت خوری کی اجازت بیش تر مذاہب نے دی ہے:

گوشت خوری کے سلسلے میں اسلام پر کیے جانے والے شدید اعتراضات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید اس کی اجازت صرف اسلام نے دی ہے۔ ورنہ دیگر مذاہب نے اس میں ’’بے رحمی‘‘ کے پیش نظر اسے ممنوع کر رکھا ہے، حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بیش تر مذاہب گوشت خوری کے قائل ہیں۔

مسلمانوں کے علاوہ یہود اور نصاریٰ گوشت کھاتے ہیں اور ان کی مذہبی کتابوں میں صراحۃً اس کی اجازت دی گئی ہے۔ بودھ اور ہندو حضرات عموماً گوشت خوری کو ناپسند کرتے ہیں اور اسے ہنسا یعنی جان دار چیزوں پر ظلم تصور کرتے ہیں۔ لیکن ان کی مذہبی کتابوں میں بھی اس کی اجازت موجود ہے اور ان کے درمیان عرصہ تک گوشت خوری کا چلن رہا ہے۔ بعد میں بعض اسباب سے ازخود پابندی عائد کر دی گئی۔

بدھ مت کے بانی گوتم بدھ کے زمانے میں گوشت خوری عام تھی اور انہوں نے کبھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ البتہ ان کے زمانے میں ویدک دھرم کے ماننے والے یگیہ میں جانوروں کی اندھا دھند قربانی کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی، کیوں کہ یہ جانور کارآمد ہوتے تھے اور غریبوں سے زبردستی ہتھیا لیے جاتے تھے۔ وہ خود بھی گوشت کھاتے تھے۔ انتقال سے قبل انہوں نے گوشت کھایا تھا۔

بدھ مت کے ماننے والوں میں جانور ذبح نہ کرنے کا رجحان ڈھائی سو سال قبل مسیح کے ایک بدھ حکمراں اشوک کے زمانے سے پیدا ہوا ہے۔ اس عہد میں دیوتاؤں کے نام پر اور ان کے آستانوں پر جانوروں کی قربانی کرنے اور ان کا گوشت کھانے کا عام

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الذبائح، باب جلود المیتۃ۔ یہ حدیث موطا، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی میں بھی مروی ہے۔

رواج تھا۔ اشوک نے اس کو حکماً بند کر دیا اور اس قانون کو سختی سے نافذ کیا۔

ہندومت کی مذہبی کتابوں میں بھی گوشت خوری کی اجازت صریح الفاظ میں دی گئی ہے اور ابتدائی زمانوں میں اسی پر عمل تھا۔ اس سلسلے میں چند تصریحات ملاحظہ ہوں:

رگ وید میں ہے: ”تیرے لیے اے اندر، جس کی حمد وثنا تمام ماروت یکساں طور پر خوش ہو کر کرتے ہیں، پسان اور وشنو تمہارے لیے ایک سو بھینس پکائیں۔“ (۶۔۱۱۔۱۷)

”......وہ بیلوں کو پکاتے ہیں اور تم ان کو کھاتے ہو“ (۱۰۔۲۸۔۳)

منوسمرتی کی حیثیت ویدوں کے خلاصے کی ہے۔ اسے ہندو قانون کی بنیادی کتاب تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں ہے:۔

”اگلے زمانے میں رشیوں نے یگیہ کے واسطے کھانے کے لائق ہرن اور پرندوں کو مارا ہے“ (۵:۲۳)

”کھانے کے لائق جانوروں کو کھانے والے کو دوش (گناہ) نہیں ہوتا، کیوں کہ کھانے کے لائق جانور کو اور نہ کھانے والے جانور کو برہما جی نے پیدا کیا ہے“ (۵:۳۰)

”برہما جی نے یگیہ کے لیے خود ہی جانور کو پیدا کیا، اس لیے یگیہ میں جو جانوروں کا قتل ہوتا ہے وہ قتل نہیں کہلاتا“ (۵:۳۹)

رام چندر جی کو ہندومت میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔ وہ وشنو دیوتا کے اوتار مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے جب چودہ سال کا طویل عرصہ اپنی بیوی سیتا اور بھائی لچھمن کے ساتھ بن باس میں گزارا تو اس دوران جنگلی پھلوں کے علاوہ ہرن اور دوسرے جانوروں کا شکار کیا اور ان کا گوشت کھایا۔ اس کی تفصیل والمیکی کی راماین میں موجود ہے۔

گوشت خوری کو ہندو سماج نے بہت بعد میں ترک کیا ہے۔ اشوک نے اپنے نظریۂ اہنسا کے تحت جانوروں کے ذبیحہ پر مطلق پابندی عائد کردی تھی۔ چنانچہ بودھ تہذیب کے غلبہ کی وجہ سے ہندوؤں نے قربانی اور گوشت خوری کو مستقل ترک کر دیا۔ ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے:

”ویدک قربانیوں میں جانوروں کے چڑھاوے کی طرح پھل، دودھ اور چاول

کی روٹیاں شامل ہیں۔ بعد میں جانوروں کی قربانی مذہبی اعمال سے غائب ہوگئی۔ ''[1]

مذاہب میں صرف جین مت گوشت خوری کا مخالف ہے۔ اس کا سبب اُس کا ''اہنسا'' کا نظریہ ہے۔ اہنسا کا مطلب یہ ہے کہ کسی جان دار کو تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ اس نظریہ کو اگر اس کے وسیع مفہوم میں لیا جائے تو کوئی انسان اس دنیا میں زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس لیے کہ ہر لحہ قدم قدم پر اس سے اہنسا کا صدور ہوگا۔ یہ نظریہ جین مت کے تصورِ کائنات اور نظامِ حیات سے تو ہم آہنگ ہے کہ وہ ترکِ دنیا، ترکِ تمدن اور ترکِ خواہشات ولذات کا داعی ہے، لیکن جو مذاہب دنیا اور اسبابِ دنیا سے فرار کی تلقین نہیں کرتے ان کے نزدیک یہ کیوں کر قابلِ قبول ہوسکتا ہے۔؟

☆ ☆ ☆

---

[1] ہندوستانی تہذیب پر اسلام کا اثر، ص: ۳

قرآن میں مذکور بعض محرّمات
اور ان کی تحریم کی حکمتیں

بعض قومیں اور مذاہب انسانوں کی غذائی ضروریات کے لیے حیوانات کے استعمال کی قطعاً اجازت نہیں دیتے ۔ وہ اسے بے رحمی اور سنگ دلی قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف بعض حضرات ہر جانور کو انسانی خوراک بنانے کے قائل ہیں۔ اسلام کا نقطۂ نظر اس سلسلے میں افراط اور تفریط کے درمیان ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ حیوانات کو اللہ تعالی نے انسانوں کے فائدے کے لیے پیدا کیا ہے اور ان کا ایک فائدہ یہ ہے کہ انسان بوقتِ ضرورت انہیں اپنی غذا بنائے ۔ ساتھ ہی وہ بعض جسمانی اور اخلاقی مضرات کے پیش نظر بعض حیوانات کا گوشت کھانے سے منع کرتا ہے۔ اس کا یہ نقطۂ نظر قرینِ عقل بھی ہے اور نظامِ کائنات سے ہم آہنگ بھی۔

اس سلسلے میں اسلام نے ایک اہم اصول یہ پیش کیا ہے کہ اللہ تعالی کی پیدا کردہ تمام چیزیں اصلاً حلال ہیں، سوائے ان چیزوں کے جن کی حرمت کی صراحت کردی گئی ہے ۔ اس نے حلال چیزوں کو شمار کرا کے بقیہ تمام چیزوں کو حرام نہیں کیا، بلکہ چند محرمات کی صراحت کرکے بقیہ تمام اشیاء کو حلال قرار دیا ہے۔ اہل عرب نے کھانے پینے کی بہت سی چیزوں کو حرام کرلیا تھا۔ ان کی سرزنش کی گئی کہ اللہ نے تو ان چیزوں کو حلال کیا تھا، پھر انہیں حرام کرنے کا حق انہیں کس نے دیا ہے؟ ساتھ ہی بعض ان چیزوں کا تذکرہ کیا گیا جنہیں مخصوص اسباب سے حرام ٹھہرایا گیا ہے:

قُلْ لَّا أَجِدُ فِيْ مَآ أُوْحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّماً عَلىٰ طَاعِمٍ يَّطْعَمُهُ اِلَّاأَنْ يَّكُونَ مَيْتَةً اَوْ دَماً مَسْفُوحاً أوْلَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَو فِسْقاً أُهِلَّ لِغَيْرِ الله بِهٖ(الأنعام: ۱۵۴)

اے نبی، ان سے کہو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے، اس میں تو میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام ہو، الّا یہ کہ وہ مردار ہو، یا بہتا ہوا خون ہو، یا سور کا گوشت ہو، کہ وہ ناپاک ہے، یا فسق ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔

اسلام میں بعض جانوروں کا گوشت حرام کیوں ہے؟

بعض حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ اگر اسلام گوشت خوری کا قائل ہے تو اس نے بعض جانوروں کا گوشت حرام کیوں قرار دیا ہے؟ اس نے کیوں جانوروں کے درمیان تفریق کر کے بعض کا گوشت کھانے کی اجازت دی ہے اور بعض کا گوشت کھانے سے منع کیا ہے؟ حالاں کہ تمام جانوروں کا گوشت ایک ہی طرح کے اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے اور سب کی تخلیق ایک ہی مادے سے ہوئی ہے۔

اسلام کا فلسفۂ حلّت وحرمت:

کھانے پینے کی چیزوں کے بارے میں اسلام کا حلّت وحرمت کا قانون حکمت پر مبنی ہے۔ اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جو چیزیں پاکیزہ، انسانی طبائع کے لیے پسندیدہ، فرحت بخش، مقویٔ صحت اور فائدہ مند ہیں انہیں اسلام نے حلال قرار دیا ہے اور جو چیزیں ناگوار، بدذائقہ، انسانی صحت کے لیے مضر یا بے فائدہ ہیں انہیں حرام کیا ہے۔ عہدِ جاہلیت میں لوگوں نے حلّت وحرمت کے خودساختہ پیمانے بنا رکھے تھے۔ بعض چیزوں کو اپنے طور پر حلال کر رکھا تھا اور بعض چیزوں کو حرام۔ کچھ چیزوں کا استعمال مردوں کے لیے جائز اور عورتوں کے لیے ممنوع تھا، کچھ چیزوں کو دونوں استعمال کر سکتے تھے (الانعام: ۱۳۸۔۱۴۰) قرآن نے ان کی سرزنش کی کہ اللہ کی عطا کی ہوئی پاکیزہ چیزوں کو حرام کرنے کا حق انہیں کس نے دیا ہے؟ اس نے لوگوں کو ہدایت کی کہ شیطان کے

بہکاوے میں نہ آئیں اور اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں:

> يَـٰٓأَيُّهَـا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِيْ الْاَرْضِ حَلاَلاً طَيِّباً وَّلاَ تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ(البقرة :١٦٨)
>
> لوگو، زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں، انہیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر نہ چلو۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

یہود و نصاریٰ نے بھی اسی طرح اپنی مرضی سے کچھ چیزوں کو حرام کر رکھا تھا اور کچھ چیزوں کو حلال۔ ان کے عالموں، فقیہوں اور راہبوں نے اس سلسلے میں خود ساختہ ضابطے بنا لیے تھے۔ اور عوام آنکھ بند کر کے ان کی پابندی کرتے تھے۔ اس طرح ان کی زندگی بے بنیاد بوجھوں تلے دب کر اور نام نہاد شکنجوں میں کس کر رہ گئی تھی۔ آخری نبی حضرت محمد ﷺ نے دینِ حنیف کے ذریعہ حلّت و حرمت کے صحیح ضابطوں کی جانب رہنمائی فرمائی اور انسانی زندگی کو خود ساختہ بیڑیوں اور بندشوں سے آزادی دلائی۔ سورۂ اعراف میں آپؐ کے یہ اوصاف مذکور ہیں:

> يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ . (الأعراف :١٥٧)
>
> وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے، اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

قرآن نے ایک طرف اہلِ ایمان کو تاکید کی کہ اللہ تعالیٰ نے جو پاک چیزیں ان کے لیے حلال کر رکھی ہیں، انہیں حرام نہ سمجھیں اور بلا تردّد ان کا استعمال کریں:

> يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْ لاَ تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ أَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لاَ يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلاَلاً طَيِّباً .
>
> (المائدة :٨٧-٨٨)
>
> اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں انہیں

> حرام نہ کرلو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں۔ جو کچھ حلال وطیب رزق اللہ نے تم کو دیا ہے اسے کھاؤ پیو)

دوسری طرف، انہیں حرام چیزوں کی تفصیل بتادی، تاکہ ان کے قریب نہ پھٹکیں اور ان سے اجتناب کریں۔ محرمات کا تذکرہ سن کر بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حلال چیزوں کی بھی تفصیل پیش کردی جائے۔ اس کے جواب میں انہیں اجمالی طور پر بتادیا گیا ہے کہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں:

> **يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ ؟ قُلْ : أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ** (المائدۃ: ۴)
>
> لوگ پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے؟ کہو، تمہارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کردی گئی ہیں۔

ان آیات میں حلال چیزوں کے لیے ''طَیِّبات'' اور حرام چیزوں کے لیے ''خَبَائِث'' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان دونوں کا استعمال متضاد معانی میں ہوتا ہے۔ خبائث سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے طبائعِ سلیمہ کراہت کرتی ہوں، یا وہ بدذائقہ یا ضرررساں ہوں۔ عربی زبان میں جب کسی چیز میں فساد یا ضرر پیدا ہوجائے تو کہا جاتا ہے: **خَبُثَ الشیء وأخبث**، بدرنگ چیز کو **خبیث اللون**، بدبودار چیز کو **خبیث الرائحة** اور بدمزہ چیز کو **خبیث الطعم** کہتے ہیں۔ ''**شراب خبیث**'' سے مراد وہ مشروب ہے جو ضرررساں ہو۔[۱] شراب کو ''**اُم الخبائث**''[۲] کہا جاتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ''**دواء خبیث**''[۳] کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ اس سے مراد وہ دوا ہے جو کسی ناپاک چیز سے بنائی گئی ہو، یا بہت بدمزہ ہو۔[۴]

امام فخرالدین رازیؒ نے سورۂ اعراف آیت: ۱۵۷ کی تفسیر میں لکھا ہے:

''ضروری ہے کہ طیّبات سے مراد وہ چیزیں ہوں جو انسانی طبیعتوں کو اچھی لگتی ہیں، اس لیے کہ ان کا استعمال لذّت بخش ہوتا ہے۔ اور فائدہ مند چیزوں کے بارے میں

---

[۱] لسان العرب، ابن منظور، دار صادر بیروت، ۲/۱۴۱۔۱۴۲، مادہ 'خبث'

[۲] سنن النسائی، کتاب الاشربۃ، ذکر الآثام المتولدۃ عن شرب الخمر

[۳] سنن ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی الادویۃ المکروھۃ

[۴] النھایۃ فی غریب الحدیث، ابن الاثیر، ۱/۲۷۸

اصل یہ ہے کہ وہ حلال ہوں۔ یہ آیت دلیل ہے اس بات کی کہ جو چیز انسانی طبیعت کو خوش گوار اور لذیذ ہو وہ اصلاً حلال ہے، الّا یہ کہ اس کی حرمت کی کوئی دلیل ہو۔ اسی طرح ہر وہ چیز، جس سے طبیعت کو کراہت ہو اور گھن آئے، اس کا استعمال باعثِ اذیت ہوگا۔ اور ضرر رساں چیز کے بارے میں اصل حکم حرمت کا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ہر وہ چیز، جس سے انسانی طبیعت کراہت کرے، حرام ہو، الّا یہ کہ اس کی حلت کی کوئی دلیل ہو۔[1]

بعض محرمات اور ان کی حکمتِ تحریم:

سطورِ بالا میں مذکور سورۂ انعام کی آیت: ۱۴۵ میں مردار، خون، خنزیر اور غیر اللہ کے نام پر ذبیحہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ان چیزوں کی حرمت کا تذکرہ سورۂ بقرہ آیات: ۱۷۲۔۱۷۳، سورۂ مائدہ آیت: ۳، اور سورۂ نحل آیت: ۱۱۵ میں بھی ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو انسانوں کے لیے کیوں حرام کیا ہے؟ اس کا صحیح علم تو اسی کو ہے، لیکن زمانہ کی ترقیات اور جدید علمی انکشافات سے اس کی بعض حکمتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ مردار:

مردار سے وہ جانور مراد ہے جس کی موت طبعی طور پر واقع ہوئی ہو یا وہ حادثاتی طور پر مرا ہو۔ نہ اسے ذبح کیا گیا ہو اور نہ اس کا شکار کیا گیا ہو۔

عہدِ جاہلیت میں عرب اس معاملے میں احتیاط نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ ان جانوروں کا گوشت تو نہیں کھاتے تھے جو طبعی عمر کو پہنچ کر ضعف یا کسی مرض کی بنا پر مر گئے ہوں، لیکن جو جانور کسی حادثہ کا شکار ہو کر مر گیا ہو، یا جسے انہوں نے خود جان سے مار دیا ہو (اسے ذبح نہ کیا ہو) اس کا گوشت استعمال کرتے تھے۔ جب کہ بعض لوگ ہر طرح کے مردار کا گوشت استعمال کرتے تھے، خواہ جانور کی موت طبعی طور پر ہوئی ہو یا حادثاتی طور پر۔ وہ کہتے تھے کہ جس جانور کو انسان نے مارا ہو، اگر اس کا گوشت کھانا جائز ہے تو جسے خود اللہ نے مارا ہو، اس کا گوشت کھانا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔

---

[1] تفسیر کبیر، رازی، ۳۱۰/۴

قرآن کریم میں مردار کا گوشت کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ ممانعت متعدد حکمتوں پر مبنی ہے:

(۱) مرنے کے بعد جانور میں بہت جلد تعفّن پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس کا گوشت بدبودار اور بدمزہ ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے سلیم طبیعتوں کو اسے کھانے سے کراہت ہوتی ہے۔ یہ چیز انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ انسان ذائقہ دار اور خوشبودار چیزوں کو پسند کرتا اور بدبودار اور بدذائقہ چیزوں سے اجتناب کرتا ہے۔ اپنی اسی طبعی نفاست پسندی کی وجہ سے انسان نے عرصۂ دراز سے مردار کے گوشت کو بطورِ غذا استعمال کرنا چھوڑ دیا تھا:

''اپنے تجربات کی بنا پر کئی سو سال قبل مسیح سے یہ بات انسان کے ذہن نشین ہو چکی تھی کہ عام حالت میں مردہ جانور غذا کے طور پر استعمال نہ کیے جائیں''۔[۱]

سائنسی نقطۂ نظر سے بھی مردار کا گوشت، انسانوں کی غذا بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ جسمِ انسانی کے جو اجزاء برابر تحلیل ہوتے رہتے ہیں، ان کا بدل بننے کی اس میں صلاحیت نہیں ہوتی:

''مردار جانور کھانے کے قابل نہیں ہیں۔ ان میں جلد سڑن (سڑاند) پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ انسانی غذا نہیں بن سکتے۔''[۲]

(۲) عام طور پر معلوم نہیں ہو پاتا کہ اس جانور کی موت کس وجہ سے ہوئی؟ ممکن ہے، اس نے کوئی زہریلی چیز کھالی ہو، یا کسی مرض کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی ہو۔ ان صورتوں میں زہریلا مادہ یا مرض کے جراثیم مردار کے جسم میں باقی رہتے ہیں اور اس کا گوشت استعمال کرنے سے وہ دوسرے کے بدن میں منتقل ہو کر ویسی ہی سمّیت اور ویسے ہی امراض پیدا کر سکتے ہیں۔[۳]

(۳) مردار کے جسم میں خون اور دیگر رطوبات محتبس ہو جاتی ہیں اور وہ انسانی

---

[۱] تذکرۂ حیوانات قرآن کریم میں، ڈاکٹر میر گوہر علی خاں، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص: ۲۰۵ بحوالہ
Text Book of meat Hygeine by H.Thronton and J.F.Gracy

[۲] تذکرۂ حیوانات، ص: ۲۰۴۔۲۰۵، بحوالہ سابق

[۳] تفسیر المنار، مطبعۃ المنار مصر، ۱۳۳۰ھ، جلد ۶، ص: ۱۳۴

صحت کے لیے ضرر رساں ہوتی ہیں۔[1]

انہی پہلوؤں کے مدِ نظر اسلام کے علاوہ بعض دیگر مذاہب مثلاً یہودیت اور عیسائیت میں بھی مردار کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

حادثاتی موت کی بعض صورتیں:

سورۂ مائدہ آیت: ۳ میں محرمات کے ضمن میں بعض ان جانوروں کا بھی تذکرہ ہے جن کی موت حادثاتی طور پر ہوئی ہو۔ مثلاً:

(۱) مُنْخَنِقَة: وہ جانور جس کی موت گلا گھٹنے سے ہوئی ہو، مثلاً گلے کی رسی تنگ ہو جائے، یا گردن کسی درخت کی دو ٹہنیوں کے درمیان پھنس جائے۔ بعض اہلِ تفسیر نے اس میں اس جانور کو بھی شامل کیا ہے جسے کوئی انسان گلا گھونٹ کر مار دے۔ لیکن مفسر طبری نے اس کی تردید کی ہے اور کہا کہ اگر یہ مفہوم ہوتا تو اس کے لیے ''مخنوقة'' کا لفظ آتا۔ منخنقة سے مراد وہ جانور ہے جس کی موت حادثاتی طور پر گلا گھٹنے سے ہوئی ہو، اسے مارنے میں کسی انسان کا عمل دخل نہ ہو[2]۔ علامہ رشید رضا مصری صاحبِ تفسیر المنار نے بھی اس کی تائید کی ہے اور اسے عربی اسلوب اور نظمِ قرآن سے ہم آہنگ بتایا ہے۔[3]

(۲) مَوْقُوْذَة: وہ جانور جس کی موت کسی غیر دھار دار چیز مثلاً لاٹھی یا پتھر وغیرہ سے چوٹ لگنے کی وجہ سے ہوئی ہو۔ بعض احادیث سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ حضرت عدی بن حاتمؓ فرماتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے معراض[4] (تیر) سے شکار کرنے کا حکم دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا:

إذا أصبت بحدّه فكل، فإذا أصاب بعرضه فقُتل فإنه وقيذ فلا تأكل. [5]

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ۶/۲، تفسیر المنار، ۱۳۴/۶

[2] تفسیر طبری، طبع جدید، ۴۹۵/۹

[3] تفسیر المنار، ۱۳۸-۱۳۷/۶

[4] معراض کے معنی ہیں بغیر پر کا تیر جس کا درمیانی حصہ موٹا ہو

[5] صحیح بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب صید المعراض

اگر شکار کو تیر کا دھار دار حصہ لگے (جس سے وہ زخمی ہو جائے) تو اس کا گوشت کھالو۔
لیکن اگر اس کا درمیانی حصہ لگے جس (کی چوٹ) سے وہ مر جائے تو وہ "وقیذ" ہے
اسے نہ کھاؤ

(۳) مُتَرَدِّیَة : وہ جانور جو کسی بالائی جگہ سے نشیبی جگہ میں گر کر مر جائے، مثلاً کسی پہاڑی سے لڑھک کر کھائی میں گر جائے، چھت سے زمین پر گر جائے، یا زمین سے کنویں میں گر جائے۔

اسی طرح اگر کسی شکار کو تیر لگے، اس کے بعد وہ پہاڑی سے لڑھک کر زمین پر گر کر مر جائے تو وہ مردار کے حکم میں ہوگا۔ اس لیے کہ ممکن ہے اس کی موت تیر کے بجائے لڑھکنے کی وجہ سے ہوئی ہو۔ اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ آں حضرت ﷺ فرماتے ہیں :

وان وجدته غریقا فی الماء فلا تأکل .[1]

تیر لگنے کے بعد اگر کسی شکار کو پانی میں ڈوبا ہوا پاؤ تو اس کا گوشت نہ کھاؤ۔

دوسری روایت میں اس کا سبب بھی مذکور ہے :

فانک لا تدری الماء قتله أو سهمک[2]

اس لیے کہ تمہیں نہیں معلوم کہ اس کی موت پانی میں ڈوبنے سے ہوئی ہے یا تیر لگنے سے؟

(۴) نَطِیْحَة : وہ جانور جو کسی دوسرے جانور کی سینگ سے زخمی ہو کر مر گیا ہو۔

(۵) مَا أَکَلَ السَّبُعُ : جسے کسی درندے نے پھاڑ کھایا ہو۔ اس کی حرمت کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ اس درندے نے اس کا گوشت کھالیا ہو۔ اس کے پکڑنے اور زخمی کر دینے سے اس کی موت ہو جائے تو وہ مردار کے حکم میں ہوگا۔

حادثاتی موت کی ان صورتوں کو خاص طور پر الگ سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عہدِ جاہلیت میں بعض اہلِ عرب جو طبعی موت کا شکار ہوئے جانور کا گوشت کھانا پسند نہیں کرتے تھے، وہ کسی حادثے سے مرنے والے جانور کا گوشت بلا تردد استعمال کرتے تھے۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب الصید بالکلاب المعلمۃ والرمی

[2] حوالہ سابق

ان کے نزدیک جس جانور کی موت کا سبب معلوم ہو، اس کا گوشت کھانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

اسلامی شریعت نے مذکورہ صورتوں میں ہلاک ہونے والے جانوروں کو مردار کے عمومی حکم میں شامل کیا۔ اس لیے کہ وہ چاہتی ہے کہ انسان صرف انہی جانوروں کا گوشت استعمال کرے جنہیں بطورِ تغذیہ حاصل کرنے کا اس نے قصد و ارادہ کیا ہو اور شرعی طور پر انہیں ذبح یا شکار کیا ہو۔ اس کی مصلحت یہ ہے کہ انسان جس جانور کو اپنی غذا بنانا چاہتا ہے اس کے صحت مند ہونے سے متعلق پوری طرح اطمینان کر لے۔

حادثاتی طور پر مرنے والے جانوروں کو حرام قرار دینے کی ایک دوسری مصلحت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اسلامی شریعت چاہتی ہے کہ انسان اپنے مملوکہ جانوروں کی خوب اچھی طرح نگہداشت رکھے، ان سے غافل نہ ہو کہ وہ کسی مرض کا شکار ہو کر مر جائیں، دوسرے جانوروں سے لڑ بھڑ کر خود کو زخمی کر لیں، کوئی درندہ انہیں اٹھا لے جائے، کسی طرح پھنس کر ان کا گلا گھٹ جائے، کوئی انہیں لاٹھی، ڈنڈا یا پتھر مار بیٹھے، یا وہ کسی اور حادثہ کا شکار ہو جائیں۔

۲۔ خون:

دوسری چیز، جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے، خون ہے۔ سورہ بقرہ: ۱۷۳، اور سورۂ مائدہ: ۳ میں اس کا تذکرہ مطلق ہے، لیکن سورۂ انعام: ۱۴۵ میں اس کے ساتھ ”مسفوح“ کی قید آئی ہے، یعنی بہنے والا خون، خواہ وہ بعد میں جم جائے۔

جو خون ابتداء ہی سے جما ہوا ہو، مثلاً جگر اور طحال، یا جو گوشت کے درمیان رہ جاتا ہے، وہ حرام نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أُحلّت لنا ميتتان ودمان، فأما الميتتان فالحوت والجراد، وأما الدمان فالكبد والطحال[1]

---

[1] سنن ابن ماجہ، ابواب الاطعمۃ، باب الکبد والطحال

> ہمارے لیے دو قسم کے مُردے اور دو طرح کے خون حلال ہیں، مُردوں سے مراد مچھلی اور ٹڈی اور خون سے مراد جگر اور تلی ہیں۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ "ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہانڈی میں گوشت پکاتے تھے تو خون کا (زرد) رنگ نمایاں ہو جاتا تھا، لیکن بلا تکلف اسے کھاتے تھے۔"[1]

اہلِ عرب جاہلیت میں خون کا استعمال بطورِ غذا کرتے تھے۔ اس کا نام انہوں نے "فصید" رکھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ گوشت جما ہوا خون ہی تو ہوتا ہے، اس لیے دونوں کے استعمال میں کوئی فرق نہیں ہے[2] قرآن نے دونوں میں فرق کیا اور خون کو حرام قرار دیا۔

حرمتِ خون کی متعدد حکمتیں ہیں:

۱۔ اس سے انسانی طبیعتیں عموماً کراہت کرتی ہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اس میں موذی (Ammonia) گیس بہت زیادہ مقدار میں ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس میں ناگوار بو پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۔ اس سے جسمِ انسانی کو ضرر پہنچنے اور صحت کے متاثر ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں جسم سے تحلیل ہو کر بہت سے متعفن مواد اور رطوبات شامل ہو جاتی ہیں۔ نیز اس میں متعدد امراض کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں، جو اسے استعمال کرنے والے کے بدن میں منتقل ہو کر مرض کی کیفیات پیدا کر سکتے ہیں۔ جراثیم دودھ میں بھی ہوتے ہیں لیکن اسے جوش دینے پر وہ مر جاتے ہیں، جبکہ خون کو جوش نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ وہ معمولی حرارت سے جم جاتا ہے۔ چنانچہ اس میں جراثیم باقی رہتے ہیں۔

۳۔ خون میں غذائیت بہت معمولی ہوتی ہے۔ دوسری جانب، مشکل سے ہضم ہوتا ہے۔ نشاستہ، روغنیات، لحمیات، حیاتین اور معدنی نمکیات جسمِ انسانی کو قوت و توانائی فراہم کرنے والی چند چیزیں ہیں۔ ان میں خون میں لحمیات کی انتہائی معمولی

---

[1] تفسیر قرطبی، المطبعۃ المصریۃ القاہرہ، ۱۹۸۷ء، ۲/۲۲۲

[2] حیاۃ الحیوان، دمیری، ۲/۳۱۷، (ناشر کا نام اور سن طباعت غیر مذکور)

مقدار کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ خون میں ۷۷ تا ۸۴ فی صد پانی ہوتا ہے۔ بقیہ حصہ ٹھوس اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں تقریباً ۵ فی صد البیومن (لحمیات) اور ۱۳ فی صد فائبرن (سرخ اور سفید ذرات) ہوتے ہیں۔ خون کو منجمد ہونے سے بچانے اور قابلِ استعمال بنائے رکھنے کے لئے فائبرن کو علیحدہ کرنا پڑتا ہے۔ باقی بچ رہنے والے اجزاء خون میں پہنچ کر نہ ہضم ہونے والی Haematin میں تبدیل ہو جاتے ہیں جس سے صحت پر مضر اثرات کا خدشہ رہتا ہے۔ [1]

۳۔ خنزیر کا گوشت:

محرماتِ قرآنی میں تیسری چیز خنزیر کا گوشت ہے۔ بعض حضرات اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خنزیر اور دیگر حیوانات کے گوشت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیوں کہ دونوں کا ایک ہی مادہ (پروٹو پلازم) ہوتا ہے۔ اس لیے دونوں میں فرق کر کے ایک کو حرام اور دوسرے کو حلال قرار دینا خلافِ عقل ہے۔

قرآن کریم نے بعض چیزوں کو حرام قرار دینے میں انسانی طبیعت کی کراہت اور اس کو لاحق ہونے والے ضرر کو پیشِ نظر رکھا ہے، اور یہ خنزیر میں بھی موجود ہے۔ سورۂ انعام میں محرمات کے تذکرہ کے ساتھ وجہِ تحریم بھی بیان کر دی گئی ہے:

> فَاِنَّهٗ رِجۡسٌ (الأنعام-۱۴۵)
>
> اس لیے کہ وہ ناپاک ہے۔

"رجس" عربی میں گندگی یا گندی چیز کو کہتے ہیں۔ مشہور ماہر لغت زجاج کہتے ہیں: عربی زبان میں "رجس" ہر اس چیز یا عمل کو کہتے ہیں جس سے گھن آئے۔ اللہ تعالیٰ نے آیت میں مذکور چیزوں کو انتہائی ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے انہیں "رجس" کہا ہے۔ [2]

اصفہانی نے لکھا ہے: "کسی چیز کے گندی اور ناپاک ہونے کی چار صورتیں ہیں:

۱۔ انسانی طبیعت اس سے کراہت کرے۔

۲۔ عقل اس چیز کو ناپسندیدہ قرار دیتی ہو۔

---

[1] تذکرۂ حیوانات، ص: ۲۰۷۔۲۰۸

[2] لسان العرب، ۹۴/۶، مادہ 'رجس'

۳۔ شریعت میں اسے نجس کہا گیا ہو۔

۴۔ مذکورہ بالا تینوں وجہیں اس میں پائی جاتی ہوں۔ [۱]

حرمتِ خنزیر کی بھی متعدد حکمتیں ہیں:

۱۔ اسلام نے چیزوں کی حلّت و حرمت کے سلسلے میں طبعی نفاست اور نظافت کو ملحوظ رکھا ہے۔ اسی لیے اس میں ان پالتو اور حلال جانوروں کا گوشت کھانے اور دودھ پینے سے منع کر دیا گیا ہے جو فسادِ مزاج کی وجہ سے غلاظتیں کھانے لگے ہوں۔ حضرت عبد اللہؓ بن عمر فرماتے ہیں:

نهى رسول الله ﷺ عن الجلاّلة وألبانها [۲]

رسول اللہ ﷺ نے غلاظت کھانے والے جانوروں کا گوشت کھانے اور ان کا دودھ پینے سے منع کیا ہے۔

علماء کا اختلاف ہے کہ یہ نہی محض ان جانوروں کے غلاظت کھانے کی وجہ سے ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے ان کا گوشت بدبودار ہو جاتا ہے؟ اسی طرح اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ اس نہی سے مراد حرمت ہے یا کراہت؟ بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ ایسے جانوروں کو چند دنوں تک باندھ کر رکھا جائے گا، تاکہ غلاظت نہ کھا سکیں، پھر ان کا گوشت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ان کے درمیان مدتِ قید میں اختلاف ہے۔ یہ تمام تفصیلات کتبِ فقہ میں موجود ہیں۔ یہاں اس کے اجمالی تذکرہ کا مقصد یہ ہے کہ جب اسلام نے نفاست پسندی کا اس درجہ اہتمام کیا ہے تو خنزیر، جو ہمیشہ گندگی میں لت پت رہتا ہے اور غلاظت ہی جس کی غذا ہے، عین ممکن ہے کہ اس کا گوشت حرام کیے جانے کی ایک علّت اور حکمت اس کی یہ خصلتِ بد ہو۔ [۳]

۲۔ خنزیر کے گوشت میں پیشاب سے ملتی جلتی بُو پائی جاتی ہے۔ ایسی ہی بُو بکرے میں بھی ہوتی ہے، مگر اس کے ذبح کرنے کے بعد جب اس کے جسم سے اس کی

---

[۱] المفردات فی غریب القرآن، راغب اصفہانی، المطبعۃ المیمنیۃ مصر، ص: ۱۸۷

[۲] سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، باب النھی عن اکل الجلالۃ والبانھا۔ جامع ترمذی، ابواب الاطعمۃ، باب النھی عن اکل لحوم الجلالۃ والبانھا۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الذبائح، باب النھی عن لحوم الجلالۃ

[۳] ملاحظہ کیجیے تفسیر المنار، ۱۳۵/۶

کھال علیٰحدہ کردی جاتی ہے تو یہ بوٗ باقی نہیں رہتی۔ اس کے برخلاف خنزیر کے جسم سے اس کی کھال علیٰحدہ نہیں ہوتی، بلکہ اس کو ملا کر ہی اس کا گوشت کھایا جاتا ہے، اس لیے یہ بد بوٗ گوشت میں باقی رہتی ہے اور مہینوں زائل نہیں ہوتی۔ حالاں کہ گوشت ٹھنڈا ہونے کے بعد یہ بہ بتدریج کم ہوتی جاتی ہے، مگر جوں ہی اس کو پکایا جاتا ہے، یہ بد بو پھر سے عود کر آتی ہے۔[1]

۳۔ اس کے عضلاتی ریشوں میں چربی بڑی مقدار میں پائی جاتی ہے (تقریباً ۳۵ فیصد) اسی وجہ سے اس کا گوشت دیگر حیوانات کے گوشت کے مقابلے میں عسیر الہضم ہوتا ہے۔ اس کے استعمال سے معدہ میں گرانی، بے چینی، قے اور اسہال جیسے عوارض لاحق ہوتے ہیں۔

۴۔ اس کا گوشت خون میں روغنی اجزاء کا تناسب ضرورت سے زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی چربی بہت کم مقدار میں تحلیل ہوتی ہے۔ چناں چہ خون میں Lipid اور Cholesterol کی مقدار میں اضافہ ہوجاتا ہے اور شریانیں (Arteries) سخت ہوجاتی ہیں۔ خون میں چربی کا زیادہ مقدار میں ہونا فالج اور ہارٹ اٹیک جیسے امراض کا سب سے بڑا سبب ہے۔

۵۔ متواتر گندی خوراک اور فضلات کھانے کی وجہ سے اس کے جسم کا لمفاوی نظام (Lymphatic system) مستقل حرکت میں رہتا ہے اور حفاظت کرنے والے اجزاء (Anti Bodies) سے بھرا رہتا ہے۔ یہ اجزاء دوسرے جسموں کے لئے انتہائی زہریلے اور مہلک اثرات رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر اس کے گوشت کے مسلسل استعمال سے مختلف قسم کی الرجی پیدا کرنے والی بیماریاں، پٹھوں کی سوجن وغیرہ پیدا ہوجاتی ہیں۔

۶۔ اس کے گوشت میں ایک زہریلی پروٹین Sutoxin ہوتی ہے جس سے کئی قسم کی الرجک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، مثلاً ایگزیما اور دمہ۔ اگر اس کی مقدار کم ہوتی ہو تو اس سے جوڑوں کے درد کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے گوشت میں

---

[1] تذکرۂ حیوانات، ص: ۲۰۹

Muco-Polysac Charides کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے بھی جوڑوں کی مختلف بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

۷۔ اس کے پھیپھڑوں میں ایک وائرس بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے جسے Shape Virus کہتے ہیں۔ یہ وائرس انسانی پھیپھڑوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اسی لیے بہت سے یورپی ملکوں میں خنزیر کا پھیپھڑا کھانا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس وائرس سے مکمل حفاظت نہیں ہوسکی ہے، اس لیے کہ یہ اس کے گوشت میں بھی ہوتا ہے۔

۸۔ اس کے گوشت میں بعض طفیلیے ہوتے ہیں جنہیں Helminathic Parasites کہتے ہیں۔ ان سے انسان مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

ایک طفیلیہ Taenia solium ہے۔ اس کی تھیلیاں (Cysts) خنزیر کے گوشت میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ایک سروے کے مطابق ایک پونڈ گوشت میں تین ہزار تھیلیاں پائی گئیں۔ ایسا گوشت جب انسان کے معدہ میں پہنچتا ہے تو رطوبتِ معدہ سے یہ تھیلیاں گل جاتی ہیں اور ان میں موجود لاروے (Larvae) باہر نکل آتے ہیں۔ یہ لاروے معدہ اور آنتوں میں پائی جانے والی بال جیسی باریک نسوں کے ذریعے دل، دماغ، جگر، آنکھ اور عضلات میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں محفوظ جھلّیاں (Cysts) بنالیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے یہ اعضاء مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، مثلاً دماغی رسولیاں، ہارٹ اٹیک، اندھاپن وغیرہ۔

دوسرا طفیلیہ Trichinella spiralis ہے، یہ کیچوے کے مشابہ بہت چھوٹے سائز کا طفیلیہ ہے جو خنزیر، چوہے اور کتے کی آنتوں اور گوشت میں پایا جاتا ہے۔ متاثر خنزیر کا گوشت کھانے سے یہ طفیلیہ معدہ اور آنتوں سے خون کی باریک نالیوں کے ذریعہ سیدھے گوشت کے اندرونی حصوں میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں اپنے گرد جھلّی (Cysts) بناکر خود کو محفوظ کرلیتا ہے۔ اس کے زہریلے مادے سے ابتداء میں دردِ معدہ، متلی، قے، بخار، پٹھوں اور جوڑوں میں درد، سانس لینے میں تکلیف جیسے عوارض ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر اکثر دل، دماغ اور جگر بھی متاثر ہوجاتے ہیں۔

خنزیر کے گوشت کو ان طفیلیوں سے پاک کرنے کے لیے آج کل نئی نئی تکنیک

اور طرح طرح کے سائنسی آلات استعمال کیے جا رہے ہیں۔ مثلاً گوشت کے ٹکڑے کر کے اسے تین چار ہفتوں تک Brine Solution میں رکھا جاتا ہے، یا اس میں نمک لگایا جاتا ہے، یا اسے خوب ٹھنڈا کیا جاتا ہے، یا (۱۱۳ سے ۱۲۲ درجہ سینٹی گریڈ تک) خوب جوش دیا جاتا ہے۔ ٹھنڈا کرنے یا جوش دینے کا یہ عمل کئی گھنٹے جاری رہتا ہے، تا کہ گوشت کے اندرونی حصوں میں محفوظ تھیلیاں فنا ہو جائیں۔ لیکن تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس کے گوشت کے ساتھ لگی ہوئی چربی کی موٹی تہہ، ابالنے کے وقت حرارت کو گوشت کے اندرونی حصوں میں خاطر خواہ انداز میں پہنچنے نہیں دیتی۔ اس بنا پر گوشت میں موجود سارے طفیلیے اور ان کی تھیلیاں فنا نہیں ہو پاتیں۔[1]

ان تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کا خنزیر کے گوشت کو حرام قرار دینا عین قرینِ عقل ہے۔

۴۔ غیر اللہ کے نام پر ذبیحہ:

قرآن نے اس جانور کا گوشت بھی حرام قرار دیا ہے جسے ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کے علاوہ کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ عہدِ جاہلیت میں مشرکینِ عرب اپنے بتوں کے سامنے نذر و نیاز کرتے، ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور ان کے نام پر جانور قربان کرتے تھے، قرآن نے ان اعمال کو مشرکانہ قرار دیا اور ایسے جانور کا گوشت استعمال کرنے سے روک دیا۔

غیر اللہ کے ذبیحہ کے لیے ''أَوْ فِسْقاً اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ '' (الأنعام:۱۴۵) کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ أُهِلّ کے لغوی معنی ابتداء میں چاند دیکھتے وقت آواز بلند کرنے کے تھے۔ بعد میں اس کا استعمال کسی بھی موقع پر آواز بلند کرنے کے لیے ہونے لگا۔ پیدائش کے وقت بچے کے رونے کی آواز کو إهلال الصّبیّ کہتے ہیں۔ عربوں کی عادت تھی کہ جانور کو ذبح کرتے وقت، جس کے نام پر اسے ذبح کرتے تھے، اس کا زور سے نام لیتے تھے۔[2] آیت میں

---

[1] ملاحظہ کیجیے تذکرۂ حیوانات، ص:۲۰۹۔۲۱۴

[2] تفسیر قرطبی، ۲/۲۲۴، المفردات فی غریب القرآن، ص:۵۶۶

وہ ذبح کے معنی میں ہے۔[۱] خواہ زور سے نام لیا جائے یا دل میں نیت کر لی جائے۔

سورۂ انعام میں ہدایت کی گئی ہے کہ جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، ان کے علاوہ دیگر تمام جانور حلال ہیں۔ انہیں اگر اللہ کے نام سے ذبح کیا جائے تو ان کا گوشت بلا تردّد استعمال کرنا چاہیے (آیات: ۱۱۸-۱۱۹) لیکن اگر ان پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو تو پھر ان کا کھانا جائز نہیں۔ فرمایا:

وَلاَ تَاكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهٗ لَفِسْقٌ (الأنعام - ۱۲۱)

اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو اس کا گوشت نہ کھاؤ، ایسا کرنا فسق ہے۔

یہاں ''فسق'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، حکم عدولی اور سرتابی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف وہی جانور حرام نہیں ہے جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، بلکہ وہ بھی حرام ہے جسے اللہ کا نام لیے بغیر ہی ذبح کر دیا جائے۔[۲]

ایسے ذبیحے کی حرمت اس میں پائے جانے والے کسی ضرر کی وجہ سے اور حفظانِ صحت کے پہلو سے نہیں ہے، بلکہ اس کا سبب خالص دینی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ اس نے حیوانات پیدا کیے، جن سے انسان اپنے فائدے کے مختلف کام لیتے ہیں اور ان سے اپنی غذائی ضروریات بھی پوری کرتے ہیں۔ انہیں ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا در اصل اس کی نعمتوں کا اعتراف اور احسان شناسی ہے۔ اور اس بات کا اظہار ہے کہ انہیں اللہ کی اجازت سے ہی ذبح کیا جا رہا ہے۔ اگر اس کی اجازت نہ ہوتی تو کسی جان دار مخلوق کی جان لینا جائز نہ ہوتا۔

اسلام عقیدے کے معاملے میں بہت حسّاس ہے۔ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بڑے سے بڑے گناہ معاف کر سکتا ہے، لیکن اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے، اس جرم کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ (النساء: ۴۸، ۱۱۶) غیر اللہ کے نام پر ذبیحہ کو حرام کر کے شرک کے ایک بڑے دروازے کو بند کر دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جو شخص کسی جانور کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتا ہے وہ گویا اللہ کے بجائے یا اللہ کے ساتھ اسے بھی

---

[۱] لسان العرب، جلد ۱۰، ص: ۳۰۸

[۲] البتہ اگر کوئی مسلمان وقتی غفلت سے ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا بھول جائے تو یہ معاف ہے اور اس کا ذبیحہ حلال ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ کا نام تو اس کے دل میں ہوتا ہی ہے۔ احادیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔

عظیم اور بالاتر ہستی اور مُنعم سمجھتا ہے۔

اسی طرح اس جانور کا گوشت بھی حرام کیا گیا جسے کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو: **وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ** (المائدہ-۳) ''نُصُب'' ''نَصِیْب'' کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ پتھر جسے غیر اللہ کی تعظیم و پرستش کے لیے کسی مقام پر بطورِ علامت نصب کیا گیا ہو۔ بعد میں اس کا استعمال عام ہو گیا اور اس سے وہ مقام مراد لیا جانے لگا جسے غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہو، خواہ وہاں کوئی پتھر یا کوئی دوسری چیز ہو یا نہ ہو۔ غیر اللہ کے نام پر ذبیحہ حرام کیے جانے کے ساتھ آستانوں کا ذبیحہ بھی حرام قرار دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حرمت مقام کی وجہ سے ہے۔ آستانوں پر جانور ذبح کرتے وقت اگر ان پر اللہ کا نام لیا جائے تو بھی وہ حرام ہوں گے۔

اس کی حرمت بھی شائبہ شرک کی وجہ سے ہے۔ مشرک قومیں زمانۂ قدیم سے اپنے دیویوں دیوتاؤں کی تعظیم میں اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کے آستانوں پر جانوروں کی بھینٹ چڑھاتی آئی ہیں۔ قرآن نے ایسے جانوروں کا گوشت حرام قرار دے کر شرک کا ایک دروازہ بند کر دیا ہے۔

چند دیگر حرام جانور:

اللہ کے رسول ﷺ نے بھی بعض حیوانات کو حرام قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

> **كل ذى ناب من السباع فأكله حرام**[1]
>
> جہاں تک کچلی والے درندوں کا تعلق ہے تو ان کا گوشت کھانا حرام ہے۔

''ناب'' اس دانت کو کہتے ہیں جو رباعیہ (سامنے کے چار دانتوں کے برابر والا دانت) کے پہلو میں ہوتا ہے۔ یہ نوک دار دانت عموماً ان جانوروں میں ہوتا ہے جو گوشت کھاتے ہیں۔ سبع سے مراد زبردستی چیر پھاڑ کرنے والا جانور ہے۔ عرف عام میں اسے درندہ کہتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ بھی بیان کرتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب تحریم اکل کل ذی ناب من السباع

نے کچلی والے درندوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے‘‘ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یہ بھی اضافہ ہے ’وعن کل ذی مخلب من الطیر‘ یعنی آپ نے پنجہ والے پرندوں کا بھی گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ [۱]

کچلی والے درندوں اور پنجہ والے پرندوں سے مراد وہ حیوانات اور پرندے ہیں جو دیگر حیوانات اور پرندوں کا شکار کرتے اور انہیں اپنی غذا بناتے ہیں۔ ان کی حرمت کی حکمت یہ ہے کہ ان کے گوشت میں ان حیوانات کی مزاجی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان کے استعمال سے مزاج میں سختی اور درشتی پیدا ہوتی ہے۔ ان سے انسانی طبیعتیں کراہت کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متمدن قومیں ان کا استعمال پسند نہیں کرتیں۔ ڈاکٹر تھورن ٹن اور ڈاکٹر گریسے نے لکھا ہے:

’’متمدن ممالک کے لوگوں کی غذا ایسے جانور ہیں جو سبزی خور ہیں، یعنی جو نباتی غذا مثلاً گھاس، پتے، دانے دار اجناس کھاتے ہیں۔ گوشت خور جانوروں بشمول کتے اور بلی کا گوشت ان کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ آج کل کتے بلی کے گوشت کو غذا کے طور پر استعمال کرنے کا رجحان متمدن ممالک میں معدوم ہو گیا ہے۔‘‘ [۲]

قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ ’’وہ ان کے لیے ’’طیّبات‘‘ (پاکیزہ چیزیں) حلال ٹھہراتا ہے اور ’’خبائث‘‘ (ناپاک چیزیں) حرام قرار دیتا ہے۔ (الاعراف: ۱۵۷) احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض حیوانات کا گوشت استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے اور بعض کے استعمال سے دوسروں کو بھی منع فرمایا ہے۔ یہ ممانعت کراہت پر دلالت کرتی ہے یا حرمت پر؟ اس سلسلے میں صحابہ کرام کے درمیان اختلاف رہا ہے اور یہ اختلاف بعد میں شارحینِ حدیث کے درمیان بھی باقی رہا ہے۔ اسی طرح بعض دیگر حیوانات کی حلّت یا حرمت کے سلسلے میں فقہاء میں اختلاف ہے۔ اس کی تفصیلات کتبِ حدیث وفقہ میں موجود ہیں۔

☆ ☆ ☆

---

[۱] صحیح مسلم، حوالہ سابق

[۲] تذکرۂ حیوانات، ص: ۲۱۴، بحوالہ The Text Book of Meat Hygeine by Horace Thornton

کتابیات

۱۔قرآن مجید:

تفسیر:

۱۔آلوسی، شهاب الدين السيد محمود البغدادی ، روح المعانی فی تفسير
القرآن العظيم والسبع المثاني، إدارة الطباعة المنيرية ، مصر

۲۔ابن العربی ،أبو بكر محمد بن عبد الله الإشبيلی المالكی،
أحكام القرآن،مطبعة السعادة مصر ، ۱۳۳۱ھ

۳۔ابن كثير، أبو الفداء عماد الدين إسماعيل ، تفسير القرآن العظيم ،
(تفسير ابن كثير) المكتبة التجارية الكبرى مصر، ۱۳۵۶ھ

۴۔اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۱۹۷۶ء

۵۔رازی، فخر الدين محمد بن عمر ، مفاتيح الغيب (التفسير الكبير) المطبعة العامرة
مصر، ۱۳۰۸ھ

۶۔رشید رضا، تفسير القرآن الكريم (تفسير المنار)، مطبعة المنار مصر ۱۳۳۰ھ

۷۔زمخشری، أبو القاسم جار الله محمود بن عمر ، الكشاف عن
حقائق التنزيل ،مطبع مصطفى البابي الحلبي وأولاده مصر، ۱۹۷۳ء

۸۔سید قطب، فی ظلال القرآن،مطبع غير مذكور ، طبع پنجم، ۱۹۶۷ء

۹۔طبری، أبو جعفر محمد بن جرير ،جامع البيان عن تاويل آي القرآن ،
طبع جديد :دار المعارف مصر ،۱۹۶۹ء طبع قديم :المطبعة الميمنية مصر، ۱۳۳۹ھ

۱۰۔قرطبی، أبو عبد الله محمد بن أحمد الأنصاري، الجامع لأحكام القرآن (تفسير قرطبى)
الهيئة المصرية العامة للكتاب مصر ،۱۹۸۷ء

۱۱۔ماوردی، أبو الحسن على بن حبيب البصري، النكت والعيون(تفسير الماوردی)
مطابع المقهوی الكويت، ۱۴۰۲ھ

حدیث وشروح حدیث:

۱۲۔ابن الأثير، مجد الدين أبو السعادات المبارک بن محمد الجزري ،جامع الأصول فی

أحاديث الرسول ، رئاسة إدارات البحوث العلمية والإفتاء والدعوة والإرشاد الرياض .
۱۳۔ابن حجر، الحافظ أحمد بن علی بن حجر العسقلاني ، فتح الباری بشرح صحيح البخاري، دار المعرفة بيروت /دار الباز مكة المكرمة
۱۴۔ابن ماجه ، أبو عبد الله محمد بن يزيد بن عبد الله القزويني ، سنن ابن ماجه
۱۵۔أبو داؤد ، سليمان بن أشعث السجستاني، سنن أبی داؤد
۱۶۔أحمد بن حنبل الشيبانی : المسند ، المطبعة الميمنية مصر، ۱۳۱۳ھ
۱۷۔بخاری ، أبو عبد الله محمد بن إسماعيل ، الجامع الصحيح المسندمن أحاديث رسول الله صلى الله عليه وسلم (صحيح البخاری)
۱۸۔بيهقی ، أبو بكر أحمد بن الحسين بن علي ، السنن الكبریٰ
۱۹۔ترمذی، أبوعيسیٰ محمد بن عيسیٰ ، جامع الترمذی
۲۰۔حاكم ، أبو عبد الله محمد بن عبد الله النيسابوري :المستدرک علی الصحيحين : دائرة المعارف العثمانية حيدر آباد دكن، ۱۳۳۴ھ
۲۱۔خطابی ، أبو سليمان أحمد بن محمد ، معالم السنن ، المطبعة العلمية حلب ، ۱۳۵۱ھ
۲۲۔دارمی ، عبد الله بن عبد الرحمٰن السمر قندي، سنن الدارمی
۲۳۔عبد الرزاق بن همّام الصنعانی ، المصنَّف ، المكتب الاسلامی بيروت ،۱۴۰۳ھ
۲۴۔عينی ، بدر الدين أبو محمد محمود بن أحمد ، عمدة القاری شرح صحيح البخاری ، مطبع مصطفى البابي الحلبي مصر، ۱۳۹۲ھ
۲۵۔مالک بن أنس الأصبحي ، المؤطّا
۲۶۔مسلم بن حجّاج القُشيري النيسابوري ، صحيح مسلم
۲۷۔ نسائی ،أبو عبد الرحمٰن أحمد بن شعيب بن علي، سنن النسائي
۲۸۔نووی ، محی الدين أبو زكريا يحيیٰ بن شرف ، شرح صحيح مسلم ، أصح المطابع ، دهلی

فقہ:

۲۹۔ابن قدامة ، أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسي ، المغني على مختصر الخرقي ، مكتبة الرياض الحديثة رياض، ۱۹۸۱ء

تاریخ:

۳۰۔ابن كثير ، أبو الفداء عماد الدين إسماعيل ، البداية والنهاية ،دار الريان للتراث مصر، ۱۹۸۸ء
۳۱۔ازرقی، أبو الوليد محمد بن عبد الله بن أحمد ،أخبار مكة، مكتبة خيّاط بيروت ۱۹۶۴ء

۳۲۔ طبری، أبو جعفر محمد بن جریر، تاریخ الرسل والملوک (تاریخ طبری) دارالمعارف مصر
۳۳۔ فاسی، أبو الطیب تقی الدین محمد بن أحمد بن علي، شفاء الغرام بأخبار البلد الحرام، مکتبة النهضة الحدیثة مکة المکرمة، ۱۹۵۶ء

سیرتِ نبوی وسیرتِ صحابہ:

۳۴۔ ابن أثیر، عزّ الدین أبو الحسن علي بن محمد الجزري، أسد الغابة في معرفة الصحابة، دارالشعب قاهره
۳۵۔ ابن حجر، الحافظ أحمد بن علی بن حجر العسقلاني، الإصابة فی تمییز الصحابة، مطبعة السعادة مصر، ۱۳۲۸ھ
۳۶۔ ابن سعد، أبو عبد الله محمد بن سعد بن منیع الزهری، الطبقات الکبری، دار صادر بیروت ۱۹۵۸ء
۳۷۔ ابن عبدالبر، أبو عمر یوسف بن عبد الله بن محمد القرطبي المالکي، الاستیعاب في معرفة الأصحاب، مکتبة نهضة مصر ومطبعتها، الفجالة، مصر
۳۸۔ ابن قیّم، شمس الدین أبو عبد الله محمد بن أبی بکر الحنبلي الدمشقي، زاد المعاد فی هدی خیر العباد، مؤسسة الرسالة بیروت، ۱۹۸۷ء
۳۹۔ ابن هشام، أبو محمد عبد الملک، سیرة النبي (سیرت ابن هشام) المکتبة التجاریة الکبری قاهره، ۱۹۳۷ء

لغت:

۴۰۔ ابن أثیر، مجد الدین أبو السعادات المبارک بن محمد الجزري، النهایة فی غریب الحدیث والأثر، المطبعة العثمانیة مصر، ۱۳۱۱ھ
۴۱۔ ابن منظور، أبو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم الإفریقي المصري، دارصادر بیروت، ۱۳۷۴ھ
۴۲۔ راغب أصفهاني، ابو القاسم الحسین بن الفضل، المفردات فی غریب القرآن، المطبعة المیمنیة مصر، ۱۳۲۴ھ

عام کتب (عربی):

۴۳۔ بغدادی، محمد بن حبیب، کتاب المحبّر، دائرة المعارف العثمانیة حیدرآباد دکن، ۱۹۴۲ء
۴۴۔ دمیری، کمال الدین، حیاة الحیوان الکبریٰ، مکتبه البیان بیروت
۴۵۔ محمد حمید الله، مجموعة الوثائق السیاسیة للعهد النبوي والخلافة الراشدة، مطبعة لجنة التألیف و الترجمة والنشر قاهره، ۱۹۴۱ء

عام کتب (اردو):

۴۶۔ اصلاحی، سلطان احمد :کم سنی کی شادی اور اسلام، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی
۴۷۔ امرتسری، ابوالوفاء ثناء اللہ :مقدس رسول، طبع دہلی ۱۹۰۶ء (طبع سوم)
۴۸۔ تاراچند، :ہندوستانی تہذیب پر اسلام کا اثر
۴۹۔ عمری، سید جلال الدین :صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات، ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ
۵۰۔ // // :غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق۔ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ
۵۱۔ // // :ہندوستان میں اسلام کی دعوت، اہمیت اور تقاضے، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی ۱۹۹۷ء
۵۲۔ گوہر علی خاں، میر :تذکرۂ حیوانات قرآن کریم میں، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی ۱۹۹۸ء
۵۳۔ محمد عمر، :ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء
۵۴۔ منصور پوری، قاضی محمد سلیمان :رحمۃ اللعالمین ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور
۵۵۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ :تفہیمات (دوم) مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی
۵۶۔ // // :الجہاد فی الاسلام، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۱ء طبع دوم
۵۷۔ // // :رسائل و مسائل (دوم و چہارم) مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۳ء
۵۸۔ ندوی، سید سلیمان، :سیرتِ عائشہ، دارالمصنفین، شبلی منزل، اعظم گڑھ، ۱۹۹۶ء طبع دہم
۵۹۔ --- دائرۃ المعارف الاسلامیہ (اردو) دانش گاہ پنجاب لاہور، جلد ۱۷
۶۰۔ --- نقوش رسول نمبر، لاہور، جلد ششم

رسائل و جرائد

- ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۲۹ء
- ماہنامہ زندگی نو، نئی دہلی، فروری ۲۰۰۰ء
- روزنامہ قومی آواز نئی دہلی، ۱۵/ مارچ ۱۹۹۰ء، ۱۶/ جنوری ۱۹۹۳ء۔
- انڈین ایکسپریس، ڈیلی، نئی دہلی، ۱۵/ مارچ ۱۹۹۰ء
- ٹائمز آف انڈیا، ڈیلی، نئی دہلی، ۱۶/ جنوری ۱۹۹۳ء۔

انگریزی:

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، طبع ۱۹۹۴ء